جمادی الأخریٰ ۱۴۳۱ھ
مئی ۲۰۱۰ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی پاکستان
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خصوصی

برسانحۂ ارتحال بانیٔ تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک
اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

صفحات: 375 قیمت اشاعت خاص: 300 روپے اشاعت عام: 200 روپے

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 قیمت اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : 59

شمارہ : 5

جمادی الاخریٰ 1431ھ

مئی 2010ء

فی شمارہ -/25

اس شمارے کی قیمت 50 روپے

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 250 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال	اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	ایوب بیگ مرزا	3
بیان القرآن	سورۃ المائدۃ (آیات [illegible])	ڈاکٹر اسرار احمد	7
اسلام کا نظامِ حیات	اسلام کا اخلاقی و [illegible] نظام (۲)	ڈاکٹر اسرار احمد	31
سُنّت و سیرت	سنتِ نبویؐ: فضیلت و اہمیت	عتیق الرحمٰن صدیقی	67
مَوتُ العالِم مَوتُ العالَم	ڈاکٹر اسرار احمد: حالاتِ زندگی اور خدماتِ دینی	انجینئر نوید احمد	75
	اسرار بھائی —— رفتید و لے نہ از دلِ ما	پروفیسر خورشید احمد	93
	''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!''	حافظ محمد ادریس	97
	احساسات	پروفیسر تسنیم احمد	105
	ڈاکٹر اسرار احمد: شخصیت، فکر اور تحریک	پروفیسر نثار احمد ملک	108
	ڈاکٹر اسرار احمد	پروفیسر میاں محمد اکرم	117
	ڈاکٹر اسرار احمد: پیکرِ صدق و وفا	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	121
	''وہ مہرباں جو مہر سے محروم کر گیا''	بلقیس قمر سبزواری	127
	اُستادِ محترم کی یاد میں	کاشف حفیظ صدیقی	132
	''اے تماشا گاہِ عالم روئے تو!''	ڈاکٹر محمد مقصود	137
	ڈاکٹر اسرار احمدؒ: ایک کارکن کی نظر میں	عبدالمتین مجاہد	142
	خادمِ قرآن: کچھ یادیں، کچھ باتیں	حافظ محمد زبیر	145
ایک یادگار تحریر	اسرار احمد —— میرا ماں جایا	اقتدار احمد مرحوم	149
تجدید و احیائے دین	ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا تاریخ میں مقام و مرتبہ	محمد نذیر یٰسین	167
ظروف و احوال	وفاتِ محترم بانیٔ تنظیم (پرنٹ میڈیا کے آئینے میں)	مرکز تعلیم و تحقیق	177
	ہفت روزہ [illegible] شدہ مضامین		189

عرضِ احوال

اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا ''زندگی بھڑک اُٹھنے اور بجھ جانے کا نام نہیں' سلگنے کا نام ہے''۔ تنظیم اسلامی کے بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے حقیقت میں زندگی کی شمع کو دونوں کناروں سے جلایا' زندگی سلگ سلگ کر گزاری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرد بجھ گیا' زیرِ زمین چلا گیا اور سپردِ خاک ہوا۔ ظاہراً منزل تو نہ پا سکا' لیکن نشانِ راہ پر چراغاں کر گیا کہ دین کے خادم ٹھوکروں سے بچ کر منزل کی طرف بڑھنے میں آسانی محسوس کریں۔ عالم اسلام کا ایک حصہ خصوصاً مسلمانانِ پاک و ہند اور امریکہ و یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کی کثیر تعداد اب یہ نہیں کہہ سکتی کہ منزل دھندلی ہے۔ اقامتِ دین کی فرضیت اگرچہ مولانا مودودیؒ کی تحریروں سے مسلمانوں پر کسی قدر آشکار ہو چکی تھی' لیکن عوامی سطح پر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اِس کا باقاعدہ ڈھنڈورا پیٹا اور شب و روز اِس کی نشر و اشاعت کے لیے ایک کر دیے۔ ایک مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں واضح کیں۔ قرآنِ پاک اور سیرتِ مطہرہ سے ثابت کیا کہ اسلام محض ارکانِ اربعہ کی ادائیگی کا نام نہیں' بلکہ یہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام محض مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل دین ہے جو اپنا نفاذ اور غلبہ چاہتا ہے۔

والدین کو یہ نام کس قدر عزیز تھا کہ اسرار احمد نامی دو بچوں کو لگاتار مہد سے سیدھے لحد میں اُتارنے کے باوجود کسی قسم کی توہم پرستی کا شکار نہ ہوئے اور بیسویں صدی کے بتیسویں سال کے اپریل کی چھبیس کو جب اُن کی گود پھر ہری ہوئی تو نومولود کا نام بھی اسرار احمد رکھ دیا۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو جب مفکرِ اسلام علامہ اقبال اِس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تو ''ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات'' کے مصداق چھ سالہ اسرار احمد نے اِسے قومی صدمے کے طور پر محسوس کیا۔ ہائی سکول کی تعلیم اپنے آبائی ضلع حصار (بھارت) میں مکمل کی۔ میٹرک کا امتحان متحدہ ہندوستان کی پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ہائی سکول کی تعلیم کے دوران ہی اقبال کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے ذہنی اور قلبی رشتہ استوار ہوا اور احیائے اسلام کے لیے عملی جدوجہد کی امنگ سینے میں پرورش پائی۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (M.S.F) کے فعال کارکن اور جنرل سیکرٹری رہے۔ اسی حیثیت سے قائداعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ہائی سکول کی تعلیم کے دوران ہی جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھا اور مولانا مودودی

سے ذہنی قربت بڑھی۔ علامہ اقبال کی ملی شاعری اور مولانا مودودی کی تحریروں سے دین کا انقلابی نظریہ اور اسلام کا Socio Poltical System جس کی بنیاد عدل پر ہے' نوجوان اسرار احمد کے قلب و ذہن میں راسخ ہو گیا۔ اُن کی سوچ کا یہ رُخ بننے لگا کہ فقہی اسلام پر بھی آسانی اور احسن طریقے سے صرف اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جبکہ ریاست میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو۔

اسرار احمد قیام پاکستان کے موقع پر براستہ سلیمانکی قافلے کے ساتھ بیس دن پیدل سفر کر کے اپنے خاندان سمیت پاکستان پہنچے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی کیا اور ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ پاکستان آنے کے بعد جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو غور سے پڑھنے اور مولانا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت حاصل کی اور مختلف ذمہ داریوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ بن گئے۔

قرآن حکیم کے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ تو لڑکپن سے تھا۔ قرآن کے سمندر میں غوطے لگا کر موتی دریافت کرنے کا ذوق پاکستان آ کر بڑھتا چلا گیا۔ عربی زبان سیکھی' کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اگرچہ وہ باقاعدہ کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل تو نہیں تھے البتہ بعض جید علماء کی صحبت سے فیض اُٹھاتے رہے۔ علامہ اقبال' ڈاکٹر رفیع الدین' مولانا فراہی' مولانا اصلاحی' مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں اور خطابات کو حرزِ جان بنایا۔ جس کا فقد نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اللہ کے پاک کلام سے ایک خصوصی ذہنی اور دلی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ بقول محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے قرآن نے انہیں possess کر لیا۔ طالب علمی کے دوران درس قرآن کی ذمہ داری مستقلاً اُن کی تھی۔ اپنے خطابات میں بھی قرآنی آیات کو ہیرے اور موتی کی طرح جڑ دیتے تھے۔ قرآن کے مدرس کی حیثیت سے اُن کی شہرت جمعیت سے وابستگی کے دوران چہار سو پھیل چکی تھی۔

میڈیکل کی تعلیم مکمل ہوئی تو ایک دن بھی جماعتی زندگی سے علیحدہ رہنا پسند نہ کیا اور جماعت اسلامی میں شرکت کر لی۔ رکنیت کا مرحلہ طے کیا اور جلد ہی جماعت اسلامی منٹگمری کی امارت اُنہیں سونپ دی گئی۔ اپنی آنکھیں اور ذہن کو کھلا رکھنا' غور و فکر کرتے رہنا' حالات کا تنقیدی جائزہ لینا اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ دینی امور کے حوالہ سے ماضی کی طرف نگاہ کرنے اور اسلاف سے رشتہ و تعلق قائم کرنے کے قائل تھے اور دنیوی امور میں جدید سے جدید تر علوم کے حصول پر زور دیتے تھے۔ اُنہوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ جماعتِ اسلامی اپنی تاسیس کے وقت جو نظریہ اور اُصول اپنائے ہوئے تھی' وقت گزرنے کے ساتھ اُس سے انحراف ہونا شروع ہو چکا ہے۔ بالآخر یہ آتش فشاں ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں پھٹ گیا۔ پچیس سالہ نوجوان نے جماعت اسلامی کے بانی امیر مولانا مودودی کے سامنے کھڑے ہو کر سوا دو گھنٹے اپنے موقف اور جماعتِ اسلامی کے نظریاتی انحراف پر دلائل دیے۔ بہرحال بات نہ بن سکی اور ڈاکٹر اسرار احمد جماعتِ اسلامی سے الگ ہو گئے۔

۱۹۷۱ء تک غمِ روزگار سے بھی نبٹتے رہے اور شہر بہ شہر اور قریہ قریہ دروسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری رہا' یعنی زندگی چکی کے دو پاٹوں میں گزرتی اور پستی رہی۔ ۱۹۷۱ء میں خانہ کعبہ میں ایک ایسا فیصلہ کیا جو وہی شخص کر سکتا ہے جو کسی شے کے عشق میں عقل و خرد کے تمام دلائل رد کر دے' جو کسی حساب کتاب میں نہ پڑے اور بے خطر حصولِ منزل کے لیے میدان میں کود جائے' یعنی یہ کہ آئندہ صرف اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں گا۔ لہٰذا واپسی پر کلینک کو تالا لگا دیا۔

۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم کی' لیکن ساتھ ہی واضح کر دیا کہ ہمارا مقصد ایک ایسی جماعت کا قیام ہے جو اُصولی اسلامی انقلابی جماعت ہوگی' جو پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے جدوجہد کرے گی۔ یوں تو ہر کلمہ گو ڈاکٹر اسرار احمد کا مخاطب تھا لیکن وہ پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو دینی علوم سے آراستہ کرنے کے زیادہ آرزومند تھے' تاکہ جب اسلامی انقلاب برپا ہو اور ایک اسلامی فلاحی ریاست وجود میں آئے تو ایسی قیادت میسّر آ سکے جو دین کی بنیادی تعلیم' اُس کے اوامر و نواہی' اُس کے محکمات اور مسلمات سے بھی بخوبی آگاہ ہو اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح آشنا ہو۔ آج قرآن اکیڈمی جہاں قائم ہے' اُس کا بھی اصل مقصد یہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے طلبہ کا قرب رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شدید خواہش تھی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان دین کا علم حاصل کر کے تحقیقی کام کریں' تاکہ اسلام پر ہونے والے طاغوتی حملوں کا مدلّل اور علمی جواب دیا جائے۔ اس لیے کہ آج کا انسان محض وعظ و نصیحت سے قائل نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کی سوچ یہ تھی کہ قرآن پاک میں انسانی زندگی کے سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو اوّلیت بھی دی گئی ہے اور اُن پر بڑی تفصیل سے روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز یہاں سے ہونا چاہیے۔ وہ اِس نقطۂ نظر کے شدید مخالف تھے کہ سیاسی اور معاشی نظام سدھر گیا تو سماجی اور معاشرتی گوشہ خود بخود درست ہو جائے گا۔ ان کا پختہ ایمان تھا کہ گھر وہ پہلا یونٹ ہے جو اصلاح کا پہلا ٹارگٹ ہونا چاہیے' اِس کی اصلاح کے بغیر بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ رزقِ حلال پر قناعت کرنے والا گھرانہ خود طاغوتی اور سرکش شیطانی قوتوں کے خلاف ایک بہت بڑا مورچہ ہے۔ شادی بیاہ کی فرسودہ رسوم کے خلاف اُن کی چلائی ہوئی تحریک ہزاروں گھرانوں میں جہالت کے اندھیرے دور کرنے اور سنتِ رسول ﷺ کے چراغ سے اُنہیں منور کرنے کا باعث بنی۔ آغاز میں اِس تحریک کو بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' لیکن آج لاکھوں نہیں تو ہزاروں خاندان یقیناً ایسے ہیں' جو وسائل رکھنے کے باوجود بچی کا نکاح مسجد میں کرتے ہیں' مسجد سے ہی دلہن کو رخصت کرتے ہیں اور کسی قسم کے کھانے کا اہتمام نہیں کرتے' بلکہ تمام تقاریب صرف ایک ولیمہ کی مسنون تقریب میں سمیٹ دیتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن پاک کو محض پڑھنا یا سننا بلکہ صرف اُس کی زیارت کرنا بھی باعثِ برکت اور ثواب ہے' لیکن ظاہر ہے کہ اگر اُسے سمجھ کر اور معنی جان کر پڑھا یا سنا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے اور

اُسی صورت میں اُس سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن ہوگا۔ دروسِ قرآن کا بھی اصل مقصد قرآن کا پیغام لوگوں کے اَذہان وقلوب میں اُتارنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سوچا کہ ماہِ رمضان میں لوگ قرآن کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں' ماحول اور فضا میں روحانیت غالب ہوتی ہے' چنانچہ نمازِ تراویح کے دوران وقفوں میں قرآنِ پاک کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا جائے۔ یہ ایک کٹھن منزل تھی لیکن اللہ ربّ العزت کے فضل وکرم سے بہ حسن وخوبی یہ ذمہ داری نبھائی اور اپنے شاگردوں کو بھی اس کی ہدایت کی۔ لہٰذا اب ہر سال رمضان میں پاکستان میں درجنوں مساجد میں روحانی بارش مسلمانوں کے دلوں کو تر کرتی ہے' جو بندگیٔ رب اور عشقِ رسول ﷺ کے بیج بو دینے کے لیے انتہائی موافق اور سازگار ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب قرآن کا پیغام عام کرنے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے حوالہ سے جس لگن اور جس انداز سے کام کرتے تھے' اس پر ہم سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کرنے والے بعض شہداء' صدّیقین اور صالحین کو مجنون اور دیوانہ کا جو طعنہ یا خطاب دیا جاتا ہے' وہ کوئی ایسا غلط نہیں ہے۔ اس لیے کہ عقل وخرد یا حکمت کے نام پر مصلحت اِس طرح کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی کہ دنیا ہی نہیں اپنی جان پر بھی اپنے مشن کو ترجیح دی جائے۔

ہم آخر میں تمام اُن حضرات سے جو ڈاکٹر صاحب سے احترام ومحبت کا رشتہ رکھتے ہیں' جنہیں ڈاکٹر صاحب کا دُنیا سے اُٹھ جانے کا شدید رنج ودکھ پہنچا ہے' گزارش کریں گے کہ ہر انسان فانی ہے اور دنیا دارالامتحان ہے۔ آپ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا کریں' کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ صرف انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ ہر انسان خطا کار اور گناہ گار ہے' لہٰذا مغفرت کی دعا کا محتاج ہے۔

اُن سے محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ اُن کا ہر عقیدت مند اُن کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے خلوص اور دلجمعی کے ساتھ جدّوجہد کرے۔ اگر پاکستان میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہوجائے تو جہاں اُن کی روح کو قرار نصیب ہوگا وہاں امتِ مسلمہ کے ہر فرد کے لیے دین پر چلنا آسان ہوجائے گا۔ یہی ڈاکٹر اسرار احمد کی زندگی کا اصل ہدف اور مشن تھا جس کی تکمیل کے لیے جدوجہد اب ہماری ذمہ داری ہوگی۔

☆☆☆

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے انتقالِ پُرملال پر رفقاء احباب کے متعدد مضامین موصول ہوئے ہیں جنہیں پیشِ نظر شمارہ میں شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔ یوں اس شمارے نے ایک خصوصی اشاعت کی حیثیت اختیار کر لی ہے' جو دو ماہ (مئی اور جون) کی اشاعتوں کے قائم مقام ہے۔

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ المَائِدۃ

تمہیدی کلمات

سورۃ المائدۃ سے قرآن مجید کی دوسری منزل کا آغاز ہوتا ہے' لیکن قرآن حکیم کے مکّی اور مدنی سورتوں کے جو گروپس ہیں' ان کے اعتبار سے پہلا گروپ ابھی ختم نہیں ہوا' بلکہ سورۃ المائدۃ اس گروپ کی آخری سورت ہے۔ ان گروپس کی تفصیل قبل ازیں بیان ہو چکی ہے۔ اُن میں سے پہلا گروپ ایک مکی سورۃ (الفاتحہ) اور چار مدنی سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ) پر مشتمل ہے۔ مضامین کی مماثلت کے اعتبار سے سورۃ المائدۃ کا ''جوڑا'' سورۃ النساء کے ساتھ بنتا ہے۔ ان دونوں سورتوں کا اسلوب بھی کافی حد تک آپس میں ملتا جلتا ہے' البتہ یہاں زیادہ زور اہلِ کتاب پر ہے۔ اس گروپ کی مدنی سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ) کے بنیادی موضوعات دو ہیں' یعنی اہلِ کتاب پر اتمامِ حجت اور احکامِ شریعتِ اسلامی۔ ان سورتوں میں ان دونوں موضوعات کا ایک تسلسل ہے جو تدریجاً نظر آتا ہے۔ لہٰذا شریعتِ اسلامی کا جو ابتدائی خاکہ ہمیں سورۃ البقرۃ میں ملتا ہے اور پھر سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء میں اس کے خدوخال مزید واضح ہوئے ہیں' یہاں سورۃ المائدۃ میں آ کر یہ تکمیلی رنگ اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی بلند ترین (حکومتی) سطح کے احکام بھی ہمیں اس سورۃ میں ملتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ کتاب سے جس خطاب کی ابتدا سورۃ البقرۃ میں ہوئی تھی' یہاں آ کر وہ بھی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

سورۃ النساء کا آغاز ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' سے ہوا تھا' جبکہ سورۃ المائدۃ کا آغاز ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا'' کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱ تا ۵

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی
عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ۝ یٰۤاَیُّهَا
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهۡرَ الۡحَرَامَ وَلَا الۡهَدۡیَ وَلَا الۡقَلَآئِدَ
وَلَاۤ آٰمِّیۡنَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرِضۡوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلۡتُمۡ
فَاصۡطَادُوۡا ؕ وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡکُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ
اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ وَتَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰی ۘ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡاِثۡمِ
وَالۡعُدۡوَانِ ۘ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ۝ حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ
الۡمَیۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِیۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ
وَالۡمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیۡحَةُ وَمَاۤ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیۡتُمۡ ؕ وَمَا ذُبِحَ عَلَی
النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِکُمۡ فِسۡقٌ ؕ اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ
کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ ؕ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ
وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ فَمَنِ اضۡطُرَّ فِیۡ
مَخۡمَصَةٍ غَیۡرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثۡمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَاۤ اُحِلَّ
لَهُمۡ ؕ قُلۡ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ مُکَلِّبِیۡنَ
تُعَلِّمُوۡنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ ۫ فَکُلُوۡا مِمَّاۤ اَمۡسَکۡنَ عَلَیۡکُمۡ وَاذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ
عَلَیۡهِ ۘ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ۝ اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ
وَطَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ ۖ وَطَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ ۫
وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ
قَبۡلِکُمۡ اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ وَلَا مُتَّخِذِیۡۤ

اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۟ؑ

آیت ۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اپنے عہد و پیمان (قول و قرار) کو پورا کیا کرو۔''

عقدہ گرہ کو کہتے ہیں جس میں مضبوطی سے بندھنے کا مفہوم شامل ہے۔ لہٰذا ''عُقُود'' سے مراد وہ معاہدے ہیں جو باقاعدہ طے پا گئے ہوں۔ معاہدوں اور قول و قرار کی اہمیت یوں سمجھ لیجیے کہ ہماری پوری کی پوری سماجی و معاشرتی زندگی قائم ہی معاہدوں پر ہے۔ معاشرتی زندگی کا بنیادی یونٹ ایک خاندان ہے' جس کی بنیاد ایک معاہدے پر رکھی جاتی ہے۔ شادی کیا ہے؟ مرد اور عورت کے درمیان ایک ساتھ زندگی گزارنے کا معاہدہ ہے۔ اس معاہدے سے انسانی معاشرے کی بلند و بالا عمارت کی بنیادی اینٹ رکھی جاتی ہے۔ اس معاہدے کے مطابق فریقین کے کچھ حقوق ہیں اور کچھ فرائض۔ ایک طرف بیوی کے حقوق اور اس کے فرائض ہیں اور دوسری طرف شوہر کے حقوق اور اس کے فرائض۔ بڑے بڑے کاروبار بھی معاہدوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ آجر اور مستأجر کا تعلق بھی ایک معاہدے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح کاروبارِ حکومت' حکومتی اداروں میں عہدے اور مناصب' چھوٹے بڑے اہلکاروں کی ذمہ داریاں' ان کی مراعات اور اختیارات کا معاملہ ہے۔ گویا تمام معاشرتی' معاشی اور سیاسی معاملات قرآن حکیم کے ایک حکم پر عمل کرنے سے درست سمت پر چل سکتے ہیں' اور وہ حکم ہے ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ''۔

﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ ''تمہارے لیے حلال کر دیے گئے ہیں مویشی قسم کے تمام حیوانات' سوائے اِن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جا رہے ہیں''

جن کا حکم آگے چل کر تمہیں بتایا جائے گا' یعنی خنزیر' مُردار وغیرہ حرام ہیں۔ باقی جو مویشی قسم کے جانور ہیں' وحشی نہیں (مثلاً شیر' چیتا وغیرہ وحشی ہیں) وہ حلال ہیں' جیسے ہرن' نیل گائے اور اس طرح کے جانور جو عام طور پر گوشت خور نہیں ہیں بلکہ سبزے پر ان کا گزارا ہے' ان کا گوشت تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔ البتہ استثنائی صورتوں کی تفصیل بعد میں تمہیں بتا دی

جائے گی۔

﴿غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ ''نہ جائز کرتے ہوئے شکار کو جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو۔''

یعنی اگر تم نے حج یا عمرے کے لیے احرام باندھا ہوا ہے تو تم اس حالت میں ان حلال جانوروں کا بھی شکار نہیں کر سکتے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ①﴾ ''بے شک اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔''

یہ اللہ کا اختیار ہے' وہ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے' جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

آیت ۲ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! مت بے حرمتی کرو اللہ کے شعائر کی اور نہ حُرمت والے مہینے کی''

یعنی اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو اپنی خواہش کے مطابق حلال مت کر لیا کرو۔

﴿وَلَا الْهَدْيَ﴾ ''اور نہ ہدی کے جانوروں کی (بے حرمتی کرو)''

یعنی قربانی کے وہ جانور جو حج یا عمرے پر جاتے ہوئے لوگ ساتھ لے کر جاتے تھے۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ حج یا عمرے پر جاتے وقت قربانی کے جانور ساتھ لے کر جاتے تھے۔ یہاں ان جانوروں کی بے حرمتی کی ممانعت بیان ہو رہی ہے۔

﴿وَلَا الْقَلَائِدَ﴾ ''اور نہ (اُن جانوروں کی بے حرمتی ہونے پائے) جن کی گردنوں میں پٹے ڈال دیے گئے ہوں''

یہ پٹے (قلادے) علامت کے طور پر ڈال دیے جاتے تھے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں اور کعبے کی طرف جا رہے ہیں۔

﴿وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ﴾ ''اور نہ عازمینِ بیت الحرام (کی عزّت و احترام میں فرق آئے)''

یعنی وہ لوگ جو بیت الحرام کی طرف چل پڑے ہوں' حج یا عمرے کا قصد کر کے سفر کر رہے ہوں' اب ان کی بھی اللہ کے گھر کے ساتھ ایک نسبت ہو گئی ہے' وہ اللہ کے گھر کے مسافر ہیں' جیسا کہ اہلِ عرب حُجّاجِ کرام کو کہتے ہیں: مَرْحَبًا بِضُيُوْفِ الرَّحْمٰن ''مرحبا ان لوگوں کو جو رحمٰن کے مہمان ہیں''۔ یعنی تمام حُجّاجِ کرام اصل میں اللہ کے مہمان ہیں' اللہ ان تمام زائرینِ

کعبہ کا میزبان ہے۔ تو اللہ کے ان تمام مہمانوں کی ہتکِ عزت اور بے حرمتی سے منع کر دیا گیا۔

﴿یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا﴾ ''وہ طلب گار ہیں اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کے۔''

یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں' اللہ کو راضی کرنے کی کوشش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہیں۔

﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ ''ہاں جب تم حلال ہو جاؤ (احرام کھول دو) تو پھر تم شکار کرو۔''

حلال ہو جانا ایک اصطلاح ہے' یعنی احرام کھول دینا' حالتِ احرام سے باہر آ جانا۔ اب تمہیں شکار کی آزادی ہے' اس پر پابندی صرف احرام کی حالت میں تھی۔

﴿وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ﴾ ''اور تمہیں آمادہ نہ کر دے کسی قوم کی دشمنی''

﴿اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''کہ انہوں نے روکے رکھا تمہیں مسجدِ حرام سے''

﴿اَنْ تَعْتَدُوْا﴾ ''کہ (تم بھی ان پر) زیادتی کرنے لگو۔''

یعنی جیسے اہلِ مکہ نے تم لوگوں کو چھ سات برس تک حج و عمرہ سے روکے رکھا' اب کہیں اس کے جواب میں تم لوگ بھی ان پر زیادتی نہ کرنا۔

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ ''اور تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو''

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ ''اور گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں تعاون مت کرو''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝۲﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

دیکھئے یہ انداز بالکل وہی ہے جو سورۃ النساء کا تھا' وہی معاشرتی معاملات اور ان کے بارے میں بنیادی اصول بیان ہو رہے ہیں۔ اب آ رہے ہیں وہ استثنائی احکام جن کا ذکر آغازِ سورۃ میں ہوا تھا کہ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ۔ کھانے پینے کے لیے جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں ان کا ذکر یہاں آخری مرتبہ آ رہا ہے اور وہ بھی بہت وضاحت کے ساتھ:

آیت ۳ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ ''حرام کیا گیا تم پر مُردار''
وہ جانور جو خود اپنی موت مرگیا ہو وہ حرام ہے۔
﴿وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ﴾ ''اور خون اور خنزیر کا گوشت''
﴿وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ ''اور جس پر پکارا گیا اللہ کے سوا کسی اور کا نام''
یعنی وہ جانور جو اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نامزد ہے' اور غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس کو ذبح کیا جا رہا ہے۔
﴿وَالْمُنْخَنِقَةُ﴾ ''اور وہ جانور جو گلا گھٹنے سے مرگیا ہو''
﴿وَالْمَوْقُوْذَةُ﴾ ''اور چوٹ لگنے سے جس جانور کی موت واقع ہوگئی ہو''
﴿وَالْمُتَرَدِّيَةُ﴾ ''اور جو جانور کسی اونچی جگہ سے گر کر مرگیا ہو''
﴿وَالنَّطِيْحَةُ﴾ ''اور جو جانور کسی دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے ہلاک ہوگیا ہو''
﴿وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ﴾ ''اور جسے کھایا ہو کسی درندے نے''
یعنی ''اَلْمَیْتَة'' کی یہ پانچ قسمیں ہیں۔ کوئی جانور ان میں سے کسی سبب سے مرگیا' ذبح ہونے کی نوبت نہیں آئی' اس کے جسم سے خون نکلنے کا امکان نہ رہا' بلکہ خون اس کے جسم کے اندر ہی جم گیا اور اس کے گوشت کا حصہ بن گیا تو وہ مُردار کے حکم میں ہوگا۔
﴿اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ﴾ ''مگر یہ کہ جسے تم (زندہ پا کر) ذبح کر لو۔''
یعنی مذکورہ بالا اقسام میں سے جو جانور ابھی مرا نہ ہو اور اسے ذبح کر لیا جائے تو اسے کھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً شیر نے ہرن کا شکار کیا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہرن مرتا شیر نے کسی سبب سے اسے چھوڑ دیا۔ اس حالت میں اگر اسے ذبح کر لیا گیا اور اس میں سے خون بھی نکلا تو وہ حلال جانا جائے گا۔ جہاں جہاں شیر کا منہ لگا ہو وہ حصہ کاٹ کر پھینک دیا جائے تو باقی گوشت کھانا جائز ہے۔
﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ ''اور وہ جانور جو کسی استھان پر ذبح کیا گیا ہو''
یعنی کسی خاص آستانے پر' خواہ وہ کسی ولی اللہ کا مزار ہو یا دیوتا' دیوی کا کوئی استھان ہو' ایسی جگہوں پر جا کر ذبح کیا گیا جانور بھی حرام ہے۔

﴿وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ﴾ ''اور یہ کہ جوئے کے تیروں کے ذریعے سے تقسیم کرو''

یہ بھی جوئے کی ایک قسم تھی۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ قربانی کے بعد گوشت کے ڈھیر لگا دیتے تھے اور تیروں کے ذریعے گوشت پر جوا کھیلتے تھے۔

﴿ذٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾ ''یہ تمام گناہ کے کام ہیں''

﴿اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ﴾ ''اب یہ کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں''

یعنی یہ لوگ اب یہ حقیقت جان چکے ہیں کہ اللہ کا دین غالب ہوا چاہتا ہے اور اس کا راستہ روکنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے' سورۃ المائدۃ نزول کے اعتبار سے آخری سورتوں میں سے ہے۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب عرب میں اسلام کے غلبہ کے آثار صاف نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ﴾ ''تو ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو''

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے''

﴿وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ ''اور تم پر اتمام فرما دیا ہے اپنی نعمت کا''

﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ''اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔''

میرے ہاں پسندیدہ اور مقبول دین ہمیشہ ہمیش کے لیے صرف اسلام ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ﴾ ''لیکن جو شخص بھوک میں مضطر ہو جائے (اور کوئی حرام شے کھا لے)''

شدید فاقہ کی کیفیت ہو' بھوک سے جان نکل رہی ہو تو ان حرام کردہ چیزوں میں سے جان بچانے کے بقدر کھا سکتا ہے۔

﴿غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ﴾ ''(بشرطیکہ) اس کا گناہ کی طرف کوئی رُجحان نہ ہو''

نیت میں کوئی فتور نہ ہو' بلکہ حقیقت میں جان پر بنی ہو اور دل میں نافرمانی کا کوئی خیال نہ ہو۔

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳﴾ ''تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

آیت ۴ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کیا حلال ہے؟''

﴿قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ﴾ ''آپ (ﷺ انھیں) بتائیں کہ تمہارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں ہیں''

﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ﴾ ''اور یہ جو تم سدھاتے ہو شکاری جانوروں کو' پھر چھوڑتے ہو ان کو شکار کے لیے' انہیں تم نے سکھایا ہے اس میں سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے''

﴿فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو تم ان کے اُس شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمہارے لیے روکے رکھیں''

﴿وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ ''اور اس پر اللہ کا نام لے لو۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴﴾ ''یقیناً اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔'' اسے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی۔

آیت ۵ ﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ﴾ ''آج تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔''

یہ وہی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ..... والا انداز ہے۔

یعنی اس سے پہلے اگر مختلف مذاہب کے احکام کی وجہ سے' یہود کی شریعت یا حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذاتی پسند و ناپسند کی بنا پر اگر کوئی رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں یا معاشرے میں رائج مشرکانہ رسومات و اوہام کی وجہ سے تمہارے ذہنوں میں کچھ اُلجھنیں تھیں تو آج ان سب کو صاف کیا جا رہا ہے اور آج تمہارے لیے تمام صاف ستھری اور پاکیزہ چیزوں کے حلال ہونے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

﴿وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ﴾ ''اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے

لیے حلال ہے۔''

لیکن یہ صرف اُس صورت میں ہے کہ وہ کھانا اصلاً حلال ہو' کیونکہ اگر ایک عیسائی سُوَر کھا رہا ہوگا تو وہ ہمارے لیے حلال نہیں ہوگا۔ اِس کھانے میں اُن کا ذبیحہ بھی شامل ہے' دو بنیادی شرائط کے ساتھ: ایک یہ کہ جانور حلال ہو اور دوسرے یہ کہ اسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔

﴿وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ ''اسی طرح تمہارا کھانا بھی ان کے لیے حلال ہے۔''

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ ''اور (تمہارے لیے حلال ہیں) اہلِ ایمان میں سے خاندانی عورتیں''

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ''اور خاندانی عورتیں اُن لوگوں کی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی''

یعنی مسلمان مرد عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کر سکتا ہے۔

﴿اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ ''جب کہ تم انہیں ادا کر دو ان کے مہر''

﴿مُحْصِنِيْنَ﴾ ''قیدِ نکاح میں لا کر ان کے محافظ بنتے ہوئے''

نیت یہ ہو کہ تم نے ان کو اپنے گھر میں بسانا ہے' مستقل طور پر ایک خاندان کی بنیاد رکھنی ہے۔

﴿غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ ''نہ کہ آزاد شہوت رانی کے لیے''

﴿وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾ ''اور نہ ہی چوری چھپے آشنائی کرنے کے لیے۔''

بلکہ معروف طریقے سے علی الاعلان نکاح کر کے تم انہیں اپنے گھروں میں آباد کرو اور ان کے محافظ بنو۔ اس ضمن میں بعض اشکالات کا رفع کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک شریعتِ اسلامی کا حکم ہے تو شریعت رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہو چکی ہے' اب اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ قانون اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ یہ تو ہے اس کا جواز' البتہ اگر آج اس کے خلاف کسی کو کوئی مصلحت نظر آتی ہے تو وہ اپنی جگہ درست ہو سکتی ہے' لیکن اس کے باوجود قانون کو بدلا نہیں جا سکتا۔ البتہ اگر ایک خالص اسلامی ریاست ہو تو حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر کچھ عرصے کے لیے کسی ایسی اجازت یا حکم کو موقوف کیا جا سکتا ہے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

ایک مرتبہ اپنے زمانے میں قحط کے سبب قطعِ ید (ہاتھ کاٹنے) کی سزا کو موقوف کر دیا تھا۔ اس طرح کسی قانون میں اسلامی حکومت کے کسی عارضی انتظامی حکم (Executive Order) کے ذریعے سے کوئی عارضی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ مزید برآں اس اجازت کے پس منظر میں جو فلسفہ اور حکمت ہے اس کی اصل روح کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ یہ اجازت صرف مسلمان مَردوں کو دی گئی ہے کہ وہ عیسائی یا یہودی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں' مسلمان عورت عیسائی یا یہودی مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر مرد عورت پر غالب ہوتا ہے' لہٰذا امکانِ غالب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اسلام کی طرف راغب کر لے گا۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں یہ بات مسلّمہ تھی کہ اولاد مرد کی ہے' اور مرد کے غالب اور فعّال ہونے کا مطلب تھا کہ ایسے میاں بیوی کی اولاد عیسائی یا یہودی نہیں بلکہ مسلمان ہوگی۔ اُس وقت ویسے بھی مسلمانوں کا غلبہ تھا اور یہودی اور عیسائی ان کے تابع ہو چکے تھے۔ آج کل حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ آج عیسائی اور یہودی غالب ہیں' جبکہ مسلمان انتہائی مغلوب۔ دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں عورتوں کا غلبہ ہے۔ لہٰذا موجودہ حالات میں مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی شادیاں نہ ہوں' لیکن بہرحال ان کو حرام نہیں کہا جاسکتا' کیونکہ اس کے جواز کا واضح حکم موجود ہے۔ ہاں اگر کوئی اسلامی ریاست کہیں قائم ہو جائے تو وہ عارضی طور پر (جب تک حالات میں کوئی تبدیلی نہ آجائے) اس اجازت کو منسوخ کر سکتی ہے۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾ ''تو جس شخص نے ایمان کے ساتھ کفر کیا اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے''

اس میں اشارہ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک محمد رسول اللہ ﷺ تشریف نہیں لائے تھے تب تک وہ اہلِ ایمان تھے لیکن اب اگر وہ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان نہیں لا رہے تو گویا وہ کفر کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان کا مدعی ہو کر کافرانہ حرکتیں کرے تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

﴿وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ ''اور آخرت میں وہ ہوگا خسارہ اٹھانے والوں میں۔''

آیات ۶ تا ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۠ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ع

آیت ۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ ''اے اہل ایمان! جب تم کھڑے ہو نماز کے لیے''

یعنی نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو۔

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ ''تو دھو لیا کرو اپنے چہرے اور دونوں ہاتھ بھی کہنیوں تک''

﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ ''اور اپنے سروں پر مسح کرلیا کرو''

﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ ''اور (دھو لیا کرو) اپنے دونوں پاؤں بھی ٹخنوں تک۔''

یہاں پر واضح رہے کہ اَرْجُلَكُمْ اور اَرْجُلِكُمْ دونوں قراءتیں مستند ہیں' لہٰذا اہل تشیع اس کو مستقلاً اَرْجُلِكُمْ پڑھتے ہیں اور ان کے نزدیک اس میں پاؤں پر مسح کا حکم ہے۔ چنانچہ وہ ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ﴾ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''اور مسح کرلیا کرو اپنے سروں پر بھی اور اپنے پاؤں پر بھی''۔ لیکن اہل سنت کے نزدیک یہ اَرْجُلَكُمْ ہے اور اِلَى الْكَعْبَيْنِ کے اضافے سے یہاں پاؤں کو دھونے کا حکم بالکل واضح ہو گیا ہے۔ اگر صرف مسح کرنا مطلوب ہوتا تو اس میں کوئی حد بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا اِلَى الْكَعْبَيْنِ کی شرط سے یہ ٹکڑا ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ کے بالکل مساوی ہو گیا ہے۔ جیسے ہاتھوں کا دھونا ہے کہنیوں تک' ایسے ہی پاؤں کا دھونا ہے ٹخنوں تک۔ اس حکم میں وضو کے فرائض بیان ہوئے ہیں۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ ''اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو پھر تم اور زیادہ پاکی حاصل کرو۔''

یعنی پورے جسم کا غسل کرو۔ جنابت کی حالت میں نماز پڑھنا یا قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ ''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو''

﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ﴾ ''یا تم میں سے کوئی کسی نشیبی جگہ سے ہو کر آئے''

یہ استعارہ ہے قضائے حاجت کے لیے۔ عام طور پر لوگ قضائے حاجت کے لیے نشیبی جگہوں پر جاتے تھے۔

﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ ''یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو''

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ ''اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو''

﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ ''تو ارادہ کرلو پاک مٹی کا''

یعنی پاک مٹی سے تیمم کرلیا کرو۔

﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ ''تو اس سے اپنے چہرے اور ہاتھوں کو مل لو۔''

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾ ''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے''

﴿وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ﴾ ''بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کردے''

﴿وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶﴾ ''اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام فرمائے تاکہ تم شکرگزار بن سکو۔''

آیت ۷ ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ﴾ ''اور اللہ نے تمہیں جو اپنی نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو اور اُس معاہدے کو بھی جو اُس نے تم سے باندھ لیا ہے (یا جس میں اس نے تمہیں باندھ لیا ہے)''

ایک میثاق وہ تھا جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا' اب ایک میثاق یہ ہے جو اہلِ ایمان سے ہو رہا ہے۔ چونکہ یہ سورۃ شروع ہوئی تھی یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا سے' یعنی اہلِ ایمان سے خطاب ہے' لہٰذا اس میثاق میں بھی اہلِ ایمان ہی مخاطب ہیں۔

﴿اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ''جب تم نے کہا تھا ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔''

سورۃ البقرۃ کی آخری آیت سے پہلے والی آیت میں اہلِ ایمان کا یہ اقرار موجود ہے: ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵﴾۔ اب جو مسلمان بھی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتا ہے وہ گویا ایک اور ایک بہت مضبوط معاہدے کے اندر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندھ جاتا ہے۔ یعنی اب اُسے اللہ کی شریعت کی پابندی کرنی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ سینوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔''

آیت ۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے

بن جاؤ''

یہاں پر سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ کا حوالہ ضروری ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ اور زیر مطالعہ آیت (المائدۃ:۸) میں ایک ہی مضمون بیان ہوا ہے' فرق صرف یہ ہے کہ ترتیب عکسی ہے (دونوں سورتوں کی نسبتِ زوجیت بھی مدّنظر رہے)۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ اور یہاں الفاظ ہیں: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾۔ ایک حقیقت تو میں نے اُس وقت بیان کر دی تھی کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ گویا ''اللہ'' اور ''قِسط'' مترادف ہیں۔ ایک جگہ فرمایا: ''قسط کے لیے کھڑے ہو جاؤ'' اور دوسری جگہ فرمایا: ''اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ''۔ اسی طرح ایک جگہ ''اللہ کے گواہ بن جاؤ'' اور دوسری جگہ ''قسط کے گواہ بن جاؤ'' فرمایا۔ تو گویا ''اللہ'' اور ''قسط'' ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ اِس آیت سے ہمارے سامنے یہ آ رہا ہے کہ معاشرے میں عدل قائم کرنے کا حکم ہے۔ انسان فطرتاً انصاف پسند ہے۔ انصاف عام انسان کی نفسیات اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ آج پوری نوعِ انسانی انصاف کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ انصاف ہی کے لیے انسان نے بادشاہت سے نجات حاصل کی اور جمہوریت کو اپنایا تاکہ انسان پر انسان کی حاکمیت ختم ہو' انصاف میسر آئے' مگر جمہوریت کی منزل سراب ثابت ہوئی اور ایک دفعہ انسان پھر سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی لعنت میں گرفتار ہو گیا۔ اب سرمایہ دار اس کے آقا اور ڈکٹیٹر بن گئے۔ اس لعنت سے نجات کے لیے اُس نے کمیونزم (Communism) کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر یہاں بھی متعلقہ پارٹی کی آمریت (One Party Dictatorship) اس کی منتظر تھی۔ گویا ''رُست از یک بند تا اُفتاد در بندے دِگر'' یعنی ایک مصیبت سے نجات پائی تھی کہ دوسری آفت میں گرفتار ہو گئے۔ اب انسان عدل اور انصاف حاصل کرنے کے لیے کہاں جائے؟ کیا کرے؟ یہاں پر ایک روشنی تو انسان کو اپنی فطرت کے اندر سے ملتی ہے کہ اس کی فطرت انصاف کا تقاضا کرتی ہے اور اپنی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے وہ عدل قائم کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے' مگر اس سے اوپر بھی ایک منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ ''العدل'' اللہ کی ذات ہے جس کا دیا ہوا نظام ہی عادلانہ نظام ہے۔ ہم اُس کے بندے ہیں' اُس کے وفادار ہیں' لہٰذا اُس کے نظام کو قائم

کرنا ہمارے ذمے ہے' ہم پر فرض ہے۔ چنانچہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ میں اسی بلند تر منزل کا ذکر ہے۔ یہ صرف فطرتِ انسانی ہی کا تقاضا نہیں بلکہ تمہاری عبدیت کا تقاضا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کے رشتے کا تقاضا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ' اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ' جو بھی اسباب و ذرائع میسر ہوں ان سب کو جمع کر کے کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے! یعنی اللہ کے دین کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور اس دین میں جو تصور ہے عدل' انصاف اور قسط کا اُس عدل و انصاف اور قسط کو قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ ہے اس حکم کا تقاضا۔

اب دیکھئے' وہاں (سورۃ النساء آیت ۱۳۵ میں) کیا تھا: ''اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور اللہ واسطے کے گواہ بن جاؤ''۔ ﴿وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ ''اگرچہ اس کی (تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی) زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین یا رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔''

انصاف سے روکنے والے عوامل میں سے ایک اہم عامل مثبت تعلق یعنی محبت ہے۔ اپنی ذات سے محبت' والدین اور رشتہ داروں وغیرہ کی محبت انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ میں اپنے خلاف کیسے فتویٰ دے دوں؟ اپنے ہی والدین کے خلاف کیونکر فیصلہ سنا دوں؟ سچی گواہی دے کر اپنے عزیز رشتہ دار کو کیسے پھانسی چڑھا دوں؟ لہٰذا ''وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ .....'' فرما کر اس نوعیت کی تمام عصبیتوں کی جڑ کاٹ دی گئی کہ بات اگر حق کی ہے' انصاف کی ہے تو پھر خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جا رہی ہو' تمہارے والدین پر ہی اس کی زد کیوں نہ پڑ رہی ہو' تمہارے عزیز رشتہ دار ہی اس کی کاٹ کے شکار کیوں نہ ہو رہے ہوں' اس کا اظہار بغیر کسی مصلحت کے ڈنکے کی چوٹ پر کرنا ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا عامل منفی تعلق ہے' یعنی کسی فرد یا گروہ کی دشمنی' جس کی وجہ سے انسان حق بات کہنے سے پہلو تہی کر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ بات تو حق کی ہے مگر ہے تو وہ میرا دشمن' لہٰذا اپنے دشمن کے حق میں آخر کیسے فیصلہ دے دوں؟ آیت زیر نظر میں اس عامل کو بیان کرتے ہوئے دشمنی کی بنا پر بھی کتمانِ حق سے منع کر دیا گیا:

﴿وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ ''اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے منحرف ہو جاؤ۔''

﴿اِعْدِلُوْا﴾ ''عدل سے کام لو''

﴿هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ''یہی قریب تر ہے تقویٰ کے''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ یقیناً اس سے باخبر ہے۔''

تمہارا کوئی عمل اور کوئی قول اس کے علم سے خارج نہیں' لہٰذا ہر وقت چوکس رہو' چوکنے رہو۔ (آیت زیر نظر اور سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ کے معانی و مفہوم کا باہمی ربط اور الفاظ کی عکسی اور reciprocal ترتیب کا حسن لائق توجہ ہے۔)

آیت ۹ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹﴾ ''اللہ کا وعدہ ہے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور اجرِ عظیم بھی۔''

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰﴾ ''اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی لوگ جہنّم والے ہیں۔''

آیت ۱۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! ذرا یاد کرو اللہ کے اُس انعام کو جو اُس نے تم پر کیا جب ارادہ کیا تھا ایک قوم نے کہ تمہارے خلاف اپنے ہاتھ بڑھائیں''

﴿فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ﴾ ''تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تم سے۔''

یہ غزوۂ احزاب کے بعد کے حالات پر تبصرہ ہے۔ اس غزوہ کے بعد ابھی کفار میں سے بہت سے لوگ پیچ و تاب کھا رہے تھے اور بعید نہیں تھا کہ وہ دوبارہ مہم جوئی کرتے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے اور ان کے دلوں میں ایسا رُعب ڈال دیا کہ وہ دوبارہ لشکر کشی کی جرأت نہ کر سکے۔ اس صورتِ حال کا ذکر اللہ تعالیٰ یہاں پر اپنے انعام کے طور پر کر رہے ہیں کہ جب کفار نے ارادہ کیا تھا کہ تم پر دست درازی کریں' تمہارے اوپر زیادتی کرنے کے لیے' تم پر فوج کشی کے لیے اقدام کریں۔

اس میں خاص طور پر اشارہ صلح حدیبیہ کی طرف ہے۔ اُس وقت بھی قریش لڑائی کے لیے بیتاب ہو رہے تھے' ان کے نوجوانوں کا خون کھول رہا تھا' لیکن بالآخر انہیں اس حقیقت کا

ادراک ہو گیا کہ اب ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا اور ان کے ہاتھوں کو مسلمانوں کے خلاف اٹھنے سے روک دیا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱﴾ ''اور تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور اہلِ ایمان کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔''

آیات ۱۲ تا ۱۹

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ
وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ
وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ
فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝۱۲ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ
قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا
تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ
فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝۱۴ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ
جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ
كَثِيْرٍ ڛ قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ
رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ
اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۶ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ
مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔـا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ
مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

اب یہاں سے بنی اسرائیل کی تاریخ کے چند واقعات آ رہے ہیں۔

آیت ۱۲ ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی میثاق لیا تھا۔''

یعنی اے مسلمانو! جس طرح آج تم سے یہ میثاق لیا گیا ہے اور اللہ نے تمہیں شریعت کے میثاق میں باندھ لیا ہے' بالکل اسی طرح کا میثاق اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے بنی اسرائیل سے بھی لیا تھا۔

﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَىْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ﴾ ''اور ان میں ہم نے مقرر کیے تھے بارہ نقیب۔''

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے' ہر قبیلے میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک نقیب مقرر کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی انصار میں بارہ نقیب فرمائے تھے' نو خزرج میں سے اور تین اوس سے۔

﴿وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ﴾ ''اور اللہ نے (ان سے) فرمایا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

میری مدد' میری تائید' میری نصرت تمہارے ساتھ شاملِ حال رہے گی۔

﴿لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ﴾ ''اگر تم نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ ادا کرتے رہے''

﴿وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ﴾ ''اور میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہے''

﴿وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ﴾ ''اور ان (رسولوں) کی تم مدد کرتے رہے''

یہ جن رسولوں کا ذکر ہے وہ پے در پے بنی اسرائیل میں آتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تو رسالت کا یہ سلسلہ ایک تار کی مانند تھا جو چھ سو برس تک ٹوٹا ہی نہیں۔ پھر ذرا سا وقفہ چھ سو برس کا آیا اور پھر اس کے بعد نبی آخر الزمان ﷺ تشریف لائے۔

﴿وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''اور اللہ کو قرضِ حسنہ دیتے رہے''

یعنی اللہ کے دین کے لیے مال خرچ کرتے رہے۔

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ ''تو میں لازماً دور کر دوں گا تم سے تمہاری برائیاں''

﴿وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور میں لازماً داخل کر دوں گا تمہیں ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

﴿فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٢﴾﴾ ''تو جس نے کفر کیا اس کے بعد تم میں سے تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر رہ گیا۔''

آیت ۱۳ ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ﴾ ''پس ان کے اپنے اس عہد کو توڑنے کے باعث ہم نے ان پر لعنت فرمائی''

میں نے سورۃ النساء آیت ۱۵۵ میں ''لَعَنّٰهُمْ'' محذوف قرار دیا تھا' لیکن یہاں پر یہ واضح ہو کر آ گیا ہے کہ ہم نے ان کے اس میثاق کو توڑنے کی پاداش میں اُن پر لعنت فرمائی۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً﴾ ''اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔''

جیسے سورۃ البقرہ (آیت ۷۴) میں فرمایا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد' پتھروں کی طرح بلکہ پتھروں سے بھی بڑھ کر سخت''۔ یہاں پر وہی بات دہرائی گئی ہے۔

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ ''وہ کلام کو اس کے اصل مقام سے ہٹاتے تھے''

﴿وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ ''اور جو کچھ ان کو دیا گیا تھا نصیحت کے طور پر اس کے اکثر حصے کو وہ بھول گئے۔''

اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا۔

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ﴾ ''اور (اے نبیؐ) آپ ہمیشہ ان کی طرف سے خیانت کی اطلاع پاتے رہیں گے''

رسول اللہ ﷺ جیسے ہی مدینہ پہنچے تھے تو آپ ﷺ نے اس نئی جگہ پر اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے پہلے چھ مہینوں میں جو تین کام کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہود کے تینوں قبیلوں سے مدینہ کے مشترکہ دفاع کے معاہدے کر لیے کہ اگر مدینے پر حملہ ہوگا تو سب مل کر اس کا دفاع کریں گے' لیکن بعد میں ان میں سے ہر قبیلے نے ایک ایک کر کے غداری کی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان کی طرف سے مسلسل خیانتیں ہوتی رہیں گی' لہٰذا آپ کو ان کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے اور ان کا توڑ کرنے کے لیے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔

﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ﴾ ''سوائے ان میں سے چند ایک کے''

ان میں سے بہت تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ﴾ ''لہٰذا (ابھی) آپؐ انھیں معاف کرتے رہیں اور درگزر سے کام لیں۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَمِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓی اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ﴾ ''اور جن لوگوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں' ہم نے ان سے بھی میثاق لیا''

﴿فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ ''تو وہ بھی بھول گئے بڑا حصہ اُس کا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی۔''

وہ اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے۔

﴿فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ﴾ ''تو ہم نے ڈال دی ان کے درمیان دشمنی اور بغض قیامت کے دن تک۔''

یہاں ایک اہم نکتہ تو یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان پورے انیس سو برس شدید دشمنی رہی ہے۔ موجودہ دور میں صورتِ حال عارضی طور پر کچھ تبدیل ہوگئی ہے۔ عیسائی جنھیں اللہ کا بیٹا بلکہ خدا سمجھتے ہیں' یہودیوں نے انہیں ولد الزنا قرار دیا اور کافر و مرتد کہتے ہوئے واجب القتل ٹھہرایا۔ یہ بنیادی اختلاف دونوں مذاہب کے پیروکاروں میں اس قدر اہم اور شدید ہے کہ اس کی موجودگی میں دونوں میں اتحاد و اتفاق ممکن ہی نہیں۔ لیکن آیت

زیرِنظر میں بنیادی طور پر عیسائیوں کی آپس کی دشمنی اور ان کا باہمی بغض وعناد مراد ہے۔ ان کے مختلف فرقوں کے درمیان نظریاتی اختلافات ان کی دلی کدورتوں اور نفرتوں سے بڑھ کر بارہا باہمی جنگ وجدل کی شکل میں نمودار ہوتے رہے ہیں۔ مذہبی بنیادوں پر عیسائی فرقوں کی آپس کی خانہ جنگیوں کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مذہب کے نام پر عیسائیوں کی خون ریزی اور قتل و غارت گری کی عبرت آموز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفصیلات ''Blood on the Cross'' نامی ضخیم کتاب میں ملتی ہیں' جو لندن سے شائع ہوئی ہے۔ خاص طور پر پروٹسٹنٹس (Protestants) اور کیتھولکس (Catholics) کی باہمی چپقلش تو کوئی پوشیدہ راز نہیں' جس کی ہلکی سی جھلک آج بھی ہمیں آئرلینڈ میں نظر آتی ہے۔

﴿وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١٤﴾﴾ ''اور عنقریب اللہ تعالیٰ جتلا دے گا انہیں جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔''

اب پھر وہی انداز ہے جو سورۃ النساء کے آخر میں تھا۔

آیت ۱۵ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا﴾ ''اے اہلِ کتاب' آ گیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول''

﴿يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ ''جو ظاہر کر رہا ہے تم پر وہ بہت سی باتیں جن کو تم چھپا رہے تھے کتاب میں سے''

﴿وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ ''اور بہت سی باتوں سے تو درگزر بھی کر رہا ہے۔''

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾﴾ ''آ چکا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور بھی اور ایک روشن کتاب بھی۔''

یہاں نور سے مراد نبی اکرم ﷺ کی شخصیت بھی ہو سکتی ہے۔ سورۃ النساء آیت ۱۷۴ میں جو فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ ''اور نازل کر دیا ہے ہم نے تمہاری طرف ایک روشن نور'' وہاں نور سے مراد قرآن ہے' اس لیے کہ حضور ﷺ کے لیے فعل اَنْزَلْنَا درست نہیں۔ لیکن یہاں زیادہ احتمال یہی ہے کہ نُور سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے' یعنی آپ ﷺ کی روح پُرنُور' کیونکہ آپ ﷺ کی روح اور روحانیت آپ ﷺ کے پورے وجود پر غالب تھی' چھائی ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ کو نورِ مجسم بھی کہا جا سکتا ہے۔ گویا آپ ﷺ

کو استعارۃً ''نور'' کہا گیا ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں نور بھی قرآن پاک ہی کو کہا گیا ہو اور ''و'' اس میں واؤ تفسیری ہو۔ اس صورت میں مفہوم یوں ہوگا: ''آ گیا ہے تمہارے پاس نور یعنی کتابِ مبین''۔

آیت ۱۶ ﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ ''اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے ان کی جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے راستوں کی طرف''

﴿وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ''اور نکالتا ہے انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف اپنے حکم سے اور ان کی رہنمائی فرماتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔''

آیت ۱۷ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ ''یقیناً کفر کیا انہوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابنِ مریم ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے ہاں جو دو عقیدے رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ ہی مسیحؑ ہے۔ اس عقیدے کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ خدا خود ہی انسانی شکل میں ظہور کر لیتا ہے۔ اس عقیدے کو God Incarnate کہا جاتا ہے' یعنی اوتار کا عقیدہ جو ہندوؤں میں بھی ہے۔ جیسے رام چندر جی' کرشن جی مہاراج اُن کے ہاں خدا کے اوتار مانے جاتے ہیں۔ چنانچہ عیسائیوں کا فرقہ Jacobites خاص طور پر God Incarnate کے عقیدے کا سختی سے قائل رہا ہے' کہ اصل میں اللہ ہی نے حضرت مسیحؑ کی شکل میں دنیا میں ظہور فرمایا۔ جیسے ہمارے ہاں بھی بعض لوگ نبی مکرم ﷺ کی محبت و عقیدت اور عظمت کے اظہار میں غلو سے کام لے کر حد سے تجاوز کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں:

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

عیسائیوں کے اسی عقیدے کا ابطال اس آیت میں کیا گیا ہے۔

﴿قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''تو ان سے پوچھیے کون ہے جسے اختیار ہو اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی''

﴿اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗ﴾ ''اگر وہ ہلاک کرنا چاہے مسیح ابنِ مریم کو اور اس کی ماں کو''

﴿وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ ''اور جو زمین میں ہیں ان سب کو''

اگر اللہ تعالیٰ ان سب کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ روک لے گا؟

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے (سب کی)۔''

﴿یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ﴾ ''وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

وہ جو چاہتا ہے' جیسے چاہتا ہے' تخلیق فرماتا ہے۔ اُس نے آدم' عیسیٰ اور یحییٰ (علیہم السلام) کو تخلیق فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اعجازِ تخلیق کی مختلف مثالیں ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ''یہودی اور نصرانی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے بڑے چہیتے ہیں۔''

یعنی بیٹوں کی مانند ہیں' بڑے لاڈلے اور پیارے ہیں۔

﴿قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ﴾ ''(تو ان سے) کہیے کہ پھر وہ تمہیں عذاب کیوں دیتا رہا ہے تمہارے گناہوں کی پاداش میں؟''

اگر تم اللہ کی اولاد ہو' اس کے بڑے چہیتے ہو' تو کیا اسی لیے بخت نصر (Nebukadnezar) کے ہاتھوں اُس نے تمہیں پٹوایا' تمہارے چھ لاکھ افراد قتل کروا دیے' چھ لاکھ قیدی بنے' تمہارا ہیکلِ اوّل بھی شہید کر دیا گیا۔ پھر آشوریوں نے تمہاری سلطنتِ اسرائیل کو روند ڈالا۔ پھر یونانیوں کے ہاتھوں تمہارا استحصال ہوا۔ پھر رومیوں نے تمہارے اوپر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے اور رومن جنرل طیطس (Titus) نے تمہارا دوسرا ہیکل بھی مسمار کر دیا۔ کیا ایسے ہی لاڈلے ہوتے ہیں اللہ کے؟ کیا اللہ اتنا ہی لاچار اور عاجز ہے کہ اپنے لاڈلوں کو ذلت و خواری اور ظلم و ستم سے بچا نہیں سکتا؟

﴿بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾ ''(نہیں) بلکہ تم بھی انسان ہو جیسے دوسرے

انسان اس نے پیدا کیے ہیں۔''

﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔''

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے' سب کی بادشاہی''

﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۸﴾ ''اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا﴾ ''اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آ چکا ہے ہمارا رسول''

﴿يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ﴾ ''جو تمہارے لیے (دین کو) واضح کر رہا ہے' رسولوں کے ایک وقفے کے بعد''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے درمیان چھ سو برس ایسے گزرے ہیں کہ اس دوران دنیا میں کوئی نبی' کوئی رسول نہیں رہا۔ اس وقفے کو اصطلاح میں 'فترت' کہا جاتا ہے۔ پھر حضور ﷺ کی بعثت ہوئی اور پھر اس کے بعد تا قیامِ قیامت رسالت کا دروازہ بند ہو گیا۔

﴿اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ﴾ ''مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس تو آیا ہی نہیں تھا کوئی بشارت دینے والا اور نہ کوئی خبردار کرنے والا''

﴿فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ﴾ ''تو (سن لو!) آ گیا ہے تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۹﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

سورۃ النساء میں یہی بات اس انداز سے بیان ہو چکی ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶۵﴾

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

اسلام کا اَخلاقی اور رُوحانی نظام

بانیٔ تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمہ اللہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

حصہ دوم

اسلام کا رُوحانی نظام

''اسلام کا اخلاقی نظام'' اور ''اسلام کا روحانی نظام'' کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک ہی مضمون کی دو سطحیں (levels) ہیں۔ مؤخر الذکر کو چاہے بلند تر کہہ لیں چاہے عمیق تر کہہ لیں' یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ جو عمارت جتنی بلند آپ کو اٹھانی ہے اس کی بنیاد اتنی ہی گہری کرنی ہوگی۔ ایک ہی منزل کی عمارت ہے تو اتنی گہرائی کی ضرورت نہیں' دو منزلیں اٹھانی ہیں تو بنیاد اور گہری کرنی ہوگی اور کثیر المنزلہ عمارت اٹھانی ہے تو اس کے لیے اور گہری بنیاد لے جانی ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ اخلاق کا معاملہ ایک ابتدائی درجہ ہے لیکن روحانیت' روحانی تعلیمات اور اس کی فکری اساسات ایک عمیق تر درجہ کی غمازی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ بلندی بھی لیے ہوئے ہیں۔ یہ اس دور کی بہت بڑی محرومی ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر یہ موضوع بہت بدنام ہو چکا ہے' لوگوں کے ذہنوں میں اس سے بہت بُعد پیدا ہو چکا ہے اور حجابات طاری ہو چکے ہیں۔ لفظِ تصوف بعض حلقوں میں تو گالی بن کر رہ گیا ہے۔ بعض اچھے بھلے دینی حلقے بھی اس سے مناسبت نہیں رکھتے۔ زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ جو لوگ مذہبی اعتبار سے فعّال ہیں' کچھ کام کر رہے ہیں' اپنی سمجھ اور اپنی سوچ کے مطابق دینی خدمتوں میں لگے ہوئے ہیں' بعض اسباب سے ان کے ہاں تصوف پر مغائرت کا پردہ حائل ہو چکا ہے اور نہ صرف اہمیت کی نفی ہے بلکہ شدت سے انکار ہے۔ اور بعض حضرات تو تصوف کو دین کی تعلیمات کے منافی قرار دے رہے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں۔

پہلا سبب جو وسیع تر ہے اس کی جہتیں (dimensions) آفاقی (Universal) ہیں اور اس نے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ایک مادی فکر (materialistic thought) ہے جو اس وقت چھا گیا ہے۔ یوں سمجھئے جیسے فضا میں معلق گرد و غبار (dust suspension) ہو تو پھر ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ وہ اسے inhale کرے۔ جب وہ سانس لے گا تو گرد لامحالہ اس کے پھیپھڑوں میں جائے گی۔ اسی طرح ہماری فضا کے اندر مادہ پرستی' مادی اخلاق' مادی سوچ' مادی اقدار ماحول کے اندر اس طرح موجود ہیں کہ ہمارے وجود میں' کسی کے کم کسی کے زیادہ' سرایت کر گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ روح کے کسی جداگانہ تشخص کا سرے سے انکار ہے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ روح اور جان (life and spirit) گویا دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ روح کا کوئی جداگانہ اور آزادانہ (independent) تشخص بھی ہے —— اس کا بہت کم لوگ اقرار کرتے ہیں۔

مغربی فکر کے غلبہ اور استیلاء کے ساتھ ساتھ تصوف سے بُعد کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ روحانیت اور روحانی تعلیمات کے لیے جو لفظ بطور عنوان اختیار کر لیا گیا یعنی ''تصوف'' یہ درحقیقت ایسا ہی ہے جیسے کبھی مشرقی پاکستان میں ''باہری'' کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا' یعنی باہر سے آئے ہوئے لوگ۔ تصوف باہری اصطلاح ہے' یہ قرآن کی اصطلاح نہیں ہے۔ پھر ایک اعتبار سے مجہول النسب ہے' یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مادہ کیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ چونکہ صوفیہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے کے لیے اُون کے کپڑے پہنتے تھے' لہٰذا یہ لفظ 'صُوف' سے بنا ہے۔ بعض نے اسے 'صفا' سے مشتق قرار دینے کی کوشش کی ہے' لیکن کوئی محقق یقینی بات نہیں کہہ سکا۔ زیادہ تر اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ یونانی اصطلاح Theosophy سے بنا ہے۔ یونانی فلسفے کے زیر اثر یہ لفظ وہاں سے آیا ہے جس نے تصوف کی شکل اختیار کر لی —— واللہ اعلم۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ تصوف نہ صرف دین کی اصل اصطلاح ''احسان'' کا قائم مقام بن گیا' بلکہ اس نے ''احسان'' کو بالکل ناک آؤٹ کر دیا۔ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاح احسان ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ''اور اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

تصوّف یا احسان؟

حدیثِ جبریلؑ میں درحقیقت ہماری مذہبی زندگی کے تین درجات (levels) کو معین

کیا گیا ہے۔ پہلا درجہ اسلام ہے' اس سے اونچا درجہ ایمان اور اس سے اونچا درجہ احسان ہے۔ حدیثِ جبریل کو ''اُمّ السُّنّۃ'' قرار دیا گیا ہے اور یہ حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ یہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے الفاظ کے فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : کَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بَارِزًا یَوْمًا لِلنَّاسِ' فَاَتَاهُ جِبْرِیْلُ' فَقَالَ: مَا الْاِیْمَانُ؟ قَالَ: ((اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِکَتِهٖ وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ)) قَالَ :مَا الْاِسْلَامُ ؟ قَالَ :((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا ' وَتُقِیْمَ الصَّلَاةَ ' وَتُؤَدِّیَ الزَّکَاةَ الْمَفْرُوْضَةَ' وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ)) ' قَالَ :مَا الْاِحْسَانُ؟ قَالَ :((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ' فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ.....))(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے' اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور پوچھنے لگے: ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتوں کا اور اس سے ملنے کا اور اس کے پیغمبروں کا یقین کرے اور مر کر جی اٹھنے کو مانے''۔ انہوں نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے' اور نماز کو قائم کرے' اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے''۔ اُس نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی ایسی عبادت کرے جیسے کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے' اور اگر یہ نہ ہو سکے تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے.....''

قرآن حکیم میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بعض اعتبارات سے مشکل بھی ہے اور بہت کم حضرات نے اس کے مضمرات پر توجہ کی ہے۔ شراب کی حرمت کی جب آخری آیت نازل ہوگئی تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں تشویش پیدا ہوئی کہ اب تک ہم پیتے رہے' یہ چیز اگر نجس ہے' مضر ہے' تو اس کے اثرات تو ہمارے وجود میں شامل ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جو حضرات حرمت کے آخری یا حتمی حکم کے آنے سے پہلے فوت ہو چکے ان کا کیا ہوگا؟ اور جو اس دوران فوت

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ہو گئے ان کو [illegible] موقع نہیں ملا' ان کا کیا ہوگا؟ (یہی تشویش تحویل قبلہ کے موقع پر ہوئی تھی کہ ہماری سولہ مہینے کی نمازیں کس حساب میں درج ہوں گی؟ وہ تو قبلہ نہیں تھا' قبلہ تو اصل یہ بیت اللہ تھا' تو ہماری سولہ مہینے کی نمازیں کیا ضائع ہو جائیں گی؟) جس طرح وہاں تسلی کرائی گئی تھی اسی طرح اس معاملے میں قرآن حکیم میں اہل ایمان کی تسلی کرائی گی:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (المائدۃ)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اُن پر کچھ گناہ نہیں اُس میں جو وہ پہلے کھا پی چکے' جب کہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی اور ایمان لائے اور نیک اعمال کیے' پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے' پھر تقویٰ اختیار کیا اور درجۂ احسان پر عمل کیا۔ اللہ دوست رکھتا ہے ایسے محسنین کو۔''

تحویلِ قبلہ کے حوالہ سے فرمایا گیا تھا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرۃ)

''اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان (نماز)' بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت رکھنے والا اور مہربان ہے۔''

جب اُس جانب رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا تو رخ اُس طرف کر لیا' اور اب اِس جانب کا حکم ہے' چنانچہ اِدھر رُخ کر کے نمازیں ادا کی جائیں گی۔ اسی طرح جب شراب کی حرمت کا آخری حکم آ گیا تو اس تشویش کو رفع کرنے کے لیے یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی۔ اس میں واضح کر دیا گیا کہ وہ لوگ جو ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرتے رہے' نیک کام کرتے رہے' ان پر کوئی حرج نہیں ہے جو کچھ بھی وہ پہلے کھا پی گئے۔ کسی شے کے آخری حکم کے نزول سے پہلے جو بھی ان کا عمل رہا ہے' جو چیزیں استعمال کی ہیں' ان پر کوئی الزام نہیں۔ اس آیت میں تقویٰ کے تین درجے بیان ہوئے ہیں۔ تقویٰ گویا اس میں moving force یعنی آگے بڑھانے والی قوت ہے' جو انسان کو نیکی پر ابھارتی ہے۔ تقویٰ نے ان کے ایمان اور عمل صالح میں ایک خاص رنگ پیدا کر دیا۔ پھر ان میں مزید تقویٰ پیدا ہوا تو ان کا ایمان اس قانونی ایمان سے بڑھ کر یقینِ قلبی پر مبنی حقیقی ایمان بن گیا۔ پھر ان کے تقویٰ نے ان کو اگلے مرحلہ تک پہنچایا جو مرحلۂ احسان ہے۔

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ..... اور احسان کا درجہ تو محبوبیتِ خداوندی کا مقام ہے۔

تصوف کے لفظ نے ''احسان'' کی اصطلاح کو ہمارے دینی لٹریچر سے بالکل خارج کر دیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب کا عنوان ہے ''مقالاتِ احسانی''۔ لیکن عام آدمی احسان کے اصل معنی جانتا ہی نہیں۔ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم نہیں کہ احسان کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ لوگوں کے ساتھ نیکی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ بس یہ تصور سامنے ہے۔ جیسے ایک قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی بدعت آئے گی سنت وہاں سے رخصت ہو جائے گی' بدعت کسی نہ کسی جگہ سے سنت کو displace کر کے اپنی جگہ بناتی ہے' اسی طرح تصوف کی اصطلاح اس طرح چھا گئی کہ اس نے ہمارے شعور' ہماری فکر اور ہماری زبانوں سے لفظ احسان کو خارج کر دیا۔

مزید برآں بعض چوٹی کے فلسفیانہ مباحث' جیسے ماہیتِ وجود' ماہیتِ زمان وغیرہ' جو مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کے مشکل مسائل ہیں' صوفیاء کے ہاں زیر بحث رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے جو بڑے صوفیاء گزرے ہیں جو تصوف کے امام تھے' وہی بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ اس دور کے ایک بہت بڑے مصنف اور مؤلف جو کہ تصوف کے شدید مخالف ہیں' ایک مرتبہ میری ان سے گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء ہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ بلند ترین منزل پر انہی صوفیاء کرام کے ہاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ بدقسمتی سے بعض فلسفیانہ مباحث بھی تصوف کا جزو لازم بن گئے ہیں۔ جیسے وحدت الوجود اور وحدت الشہود درحقیقت ایک فلسفہ ہے اور اس کا اصل میں ''احسان'' سے کوئی تعلق نہیں' لیکن چونکہ فلاسفہ اور حکماء وہی صوفیاء ہیں لہٰذا یہ خلطِ مبحث پیدا ہوا۔ چنانچہ جن لوگوں کو فلسفہ کے پیچیدہ اور عمیق مباحث سے ذہنی مناسبت نہیں ہے انہوں نے فلسفہ اور تصوف کو گڈمڈ کر کے دونوں کا انکار کر دیا۔ یہ مختلف اسباب ہیں جن کی بنا پر اسلام کی روحانی تعلیمات کا ایک عرض (dimension) ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ چونکہ اس دور میں فضا سائنسی عقلیت پسندی کی ہے کہ جو شے دیکھی جا سکتی ہو' محسوس کی جا سکتی ہو' چھوئی جا سکتی ہو' جو ہمارے حواس کی گرفت میں آ سکتی ہو' جس کی ہم توثیق کر سکتے ہوں کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں' جو ہمارے تجرباتی دائرے کے اندر آ رہی ہو' بس توجہ اور دلچسپی اور بحث و تمحیص اسی کے بارے میں ہوتی ہے' لہٰذا ان تمام اسباب نے مل جل کر یہ نتیجہ نکالا کہ دین کی تعلیم کا یہ اہم ترین شعبہ جو بعض اعتبارات سے اصل لُبِّ لُباب اور اصل مقصود قرار دیا جا سکتا ہے' اس دور میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔

دین کی روحانی تعلیمات اور احیائی تحریکیں

اس دور میں جو احیائی تحریکیں پے در پے ناکامیوں سے دوچار ہو رہی ہیں' میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ایمان کی وہ منزل یا ایمان کا وہ درجہ جس میں ایمان یقین کو پہنچ جائے' وہ ایک burning faith اور ایک living faith کی شکل اختیار کر لے اور اس کی حرارت انسان کو اپنے باطن میں محسوس ہو' یہ کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ کچھ قیل و قال' کچھ فلسفیانہ و متکلمانہ گفتگو اور کچھ دلیل و استدلال سے کوئی بات ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں کچھ آگے چلتے بھی ہیں تو تھوڑی دیر میں ہمت جواب دے جاتی ہے۔ وہ استقامت جو محبتِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے' غیر موجود ہے۔ اگر پاؤں وہاں جمے ہوئے نہیں ہیں تو استقامت ممکن نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے' پھر اس پر جم گئے ایسے لوگوں پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اس بشارت کے ساتھ) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمگین ہو اور جنت کی بشارت پاؤ جس کا کہ تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

اگر یہ استقامت نہ ہوگی تو دائیں بائیں سے کسی راہِ یسیر (short cut) کی تلاش ہوگی اور فوری نتیجہ برآمد کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ جو احیائی تحریکیں پے بہ پے ناکامیوں سے دوچار ہو رہی ہیں اس کا جب آپ گہرائی میں تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں۔ انسان کی حقیقت کو اگر نہیں سمجھا جیسا کہ قرآن میں بیان ہوئی ہے تو اسلام کے روحانی نظام کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اگرچہ وہ بطرزِ جلی بیان نہیں ہوئی' لیکن وہ لوگ جو اشارات سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں انہوں نے اسے سمجھا ہے اور بیان کیا ہے۔ انسان کا وجود مرکب وجود ہے' ایک اس کا حیوانی وجود ہے جو اس کے جسدِ خاکی اور اس کی جان کا مجموعہ ہے' جبکہ ایک اس کا روحانی وجود ہے جو اس کی روح پر مشتمل ہے۔ دونوں کا علیحدہ آزاد (independent) تشخص ہے' دونوں اپنے اپنے تقاضے رکھتے ہیں اور یہ تقاضے بہت حد تک ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد ہیں۔ دونوں کے رجحانات میں بُعد المشرقین ہے' ایک اِدھر کھینچتا ہے تو دوسرا اُدھر کھینچتا ہے۔ ایک کا رُخ پستی کی طرف ہے تو دوسرے کا رُخ

بلندی کی طرف ہے۔ ایک کا مبدأ (origin) ہی بلندی ہے اور دوسرا وہ ہے کہ جس کا وجود خاک سے قائم ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس حقیقت کو نہیں جانا جائے گا تو روحانی تعلیمات اور روحانی نظام کا سمجھنا قطعاً محال اور ناممکن ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ صرف نبی کی تعلیمات کامل ہوتی ہیں' باقی جو بھی دین کے مصلحین' مفکرین اور اصحابِ علم ہیں ان کا علم وفکر درجہ بہ درجہ ترقی کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾﴾ (الانشقاق) ''تم لازماً سیڑھی بہ سیڑھی چڑھو گے''۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی اسلامی مفکرین سے ایک خطا ہوئی۔ یہ بات تو واضح رہی کہ ایک اسلامی ریاست ایک ٹھیٹھ اسلامی تحریک کے نتیجے میں قائم ہو سکتی ہے' لیکن اس بات کا شعور کہ اس اسلامی تحریک کے افرادِ کار کے اندر ایمان کی ایک خاص گہرائی اور گیرائی درکار ہے' اس نقطہ کے حوالے سے کوتاہی محسوس ہوتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں اسلام ایک موروثی عقیدہ ہے' ہم پیدائشی طور پر مسلمان ہیں مگر ایمانِ حقیقی کی وہ صورت کہ ہر شے میں اللہ ہی فاعلِ حقیقی نظر آئے' شاذ ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر تعمیر نہ کر بنیاد نہ رکھ!

چنانچہ ایمان کی بنیادیں مستحکم کیجیے۔ ایک زندہ یقین جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کے وجود میں سرایت کیے ہوئے ہو ایسا ایمان درکار ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کی شدت (intensity) ایمان بالشہود کی مانند تھی' جیسا کہ حدیث میں ایک صحابی کا قول آتا ہے: ((وَلَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ الْجَنَّةِ ..... وَلَكَأَنِّي أَسْمَعُ عُوَاءَ أَهْلِ النَّارِ))(۱) ''گویا میں اہل جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' اور گویا میں جہنمیوں کی چیخ وپکار سن رہا ہوں''۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور اسلامی تحریک کے کارکنوں کی معتد بہ تعداد کی تربیت اس انداز میں نہیں ہوتی بظاہر احوال کامیابی کا کوئی تصور ممکن نہیں۔

یہاں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے چند جملے نقل کر رہا ہوں جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان پر نشر ہونے والی تقاریر سے ماخوذ ہیں:

''فلسفہ ومذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں' دونوں کا عالم جدا ہے' دونوں کے تقاضے الگ ہیں بلکہ باہم مخالف

(۱) الایمان لابن ابی شیبۃ' کیف اصبحت یا حارث بن مالك؟' قال: اصبحت مؤمنا.....

ہیں..... اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے.....''

ان جملوں کے بعد مولانا مرحوم نے اس نقطۂ نظر کی پُرزور نفی کی ہے اور اس ثنویت کا انکار کیا ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ فکر کی کوتاہی ہے جس کی بنا پر اسلام کی روحانی تعلیمات اور اس کے روحانی نظام سے نگاہیں بالکل محجوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف مولانا مودودیؒ کا جملہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص دور کے طرزِ فکر کا عکاس ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب تو تصوف کے شدید مخالف ہیں۔ ان کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ''میں تصوف کو سراسر ضلالت سمجھتا ہوں''۔ اس سے آگے کی بات آپ کو سرسید احمد خان' ان کے متبعین' پھر غلام احمد پرویز اور علامہ مشرقی کے ہاں مل جائے گی۔ یہ تمام وہ مکاتبِ فکر ہیں جنہوں نے دین پر بطور ''نظامِ زندگی'' غور و فکر کیا ہے اور غلطیوں اور کوتاہیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔ کم از کم مولانا مودودیؒ کے بارے میں مَیں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ بحیثیتِ مجموعی ان کا مطالعہ بہت درست ہے' خصوصیت کے ساتھ اسلام کے کامل نظامِ حیات ہونے کے حوالے سے میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ انہوں نے سیاسی اور معاشرتی نظام میں بہت صحیح تعبیر کی ہے اور اس کی بہت عمدہ تشریح و توضیح کی ہے۔ لیکن اصل کمی رہ گئی ہے دین کے باطنی پہلو کے حوالے سے جو دین کے ثمرات ہیں' جس کے لیے ہم ''روحانی نظام'' کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے بُعد ہے' دوری ہے اور بعض حالات میں اس کا انکار ہے۔

انسان ایک مرکّب وجود ہے

اس کے برعکس اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کا وجود ایک مرکب وجود ہے۔ اس کا ایک وجود' جسدِ خاکی' مٹی سے بنا ہے۔ اس کی تخلیق کا طریق کار کچھ بھی ہو یہ ایک الگ بحث ہے۔ اور اس کے اندر ایک روح ہے' جس کا تعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے قرار دیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر:۲۹) ''اور جب میں پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے''۔ یہی مضمون انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ ص (آیت ۷۲) میں بھی آیا ہے۔ اس کی ہم تفصیلی توجیہہ نہیں کر سکتے کہ اس کا مفہوم کیا ہے' لیکن بہرحال اس کا possesive mode ہے۔ انسان اور اس کے خالق کے مابین جو محبت ہے اُس کا ایک رخ ہے اللہ کا محبت کرنا بندوں کے ساتھ' اور دوسرا رُخ ہے انسان کا محبت کرنا اللہ کے ساتھ۔ یہ دوسرا رخ اس روحانی نظام کا

اصل موضوع ہے۔ ہمارے وجود کے چونکہ دو پہلو ہیں' لہٰذا ہمارے اندر محبتیں بھی دو ہیں۔ ایک محبت ہے ''حُبّ الشہوات'' جیسا کہ سورۂ آل عمران میں فرمادیا گیا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝﴾

''لوگوں کے لیے شہوانی خواہشات' عورتیں' بیٹے' سونے چاندی کے ڈھیر' نشان زدہ گھوڑے' مویشی اور کھیتی مزین کردیے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا سامان ہے' جبکہ حقیقت میں جو ٹھکانہ بہتر ہے وہ اللہ کے پاس ہے۔''

ان تمام چیزوں کی محبت انسان کے اندر موجود ہے اور یہ اس کے لیے مزین کردی گئی ہیں۔ لیکن یہ ہمارے کون سے جزو کا حصہ ہیں؟ یہ ہمارے اس حیوانی وجود کی محبت ہے۔ یہ اس وجود کے تقاضے اور اس کے تسلسل کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ محبت نہ ہو تو یہ دنیا کا ہنگامہ' یہاں کی رونقیں ختم ہو کر رہ جائیں۔ یہ محبتیں بڑی قوی ہیں' بڑی شدید ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ (العادیات) اس کی وجہ سے ساری تمدن کی رونق ہے' گہما گہمی ہے' بھاگ دوڑ ہے۔ یہ سارا معاملہ ان محبتوں پر قائم ہے۔ جہاں تک ہماری روح اور ہمارے روحانی وجود کا تعلق ہے اس کے اندر بھی ایک محبت ہے' لیکن وہ محبت دبی ہوئی ہے' اس کا ہمیں شعور نہیں ہے' اسے ہم بھلائے بیٹھے ہیں۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ (الحشر)

''ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔''

اپنے آپ سے غافل ہونا اپنے اس روحانی وجود سے غافل ہونا ہے جو اصل انسان ہے' جس کی بنا پر یہ شرف حاصل ہوا کہ انسان مسجودِ ملائک بنا' اسے خلافت میسر آئی' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾ (بنی اسراء یل)

''اور ہم نے عزت دی آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی

دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر۔''

اس اصل وجود کی جانب سے ذہول ہے اور آج کا جدید فکر اس وجود کا انکار کر رہا ہے۔ ہمارے روحانی وجود کی بھی ایک محبت ہے' لیکن یہ محبت اللہ کی محبت سے عبارت ہے۔ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق و ربط ہے جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ مولانا رومیؒ نے بڑے پیارے انداز میں ایک شعر میں کہا ہے۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را باجانِ ناس(۱)

یہ ایک ایسا اتصال اور ایسا قرب ہے جسے ہم کسی شے پر قیاس نہیں کر سکتے' اسے ہم کسی مثال سے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اتصال ہے' قرب ہے' انتہائی قرب ہے کہ اس سے زیادہ قرب کا تصور ممکن نہیں۔ اس روحانی وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا گہرا تعلق اور بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ہر انسان خود اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ اندر ایک خیر و شر کی کشمکش برپا ہے۔ کوئی شے اندر سے کھینچتی ہے برائی کی طرف اور کوئی شے اندر ہے جو مجھے برائی پر ملامت کرتی ہے اور مجھے خیر کی طرف کھینچتی ہے۔ اگر آپ کے پاس ایک ہی روٹی ہے' کچھ اور نہیں ہے اور کوئی سائل آ گیا تو آپ کے اندر ایک کشمکش ہو گی۔ کوئی قوت کہے گی کہ یہ روٹی اپنے پاس رکھو' یہ تو تمہاری ضرورت کو بھی کفایت نہیں کر رہی' دوسرے کو حصہ دار بنانے کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن کوئی شے اندر ہی اندر آپ کو راغب کرے گی کہ نہیں اس کے پاس ایک بھی روٹی نہیں ہے' اس کو بالکل فاقہ ہو جائے گا' مجھے چاہیے کہ میں اپنی روٹی میں اس کو شریک کروں۔ یہ ایک کشمکش ہے جو ہر انسان کا ہر وقت کا تجربہ ہے' ہر ایک کا ذاتی احساس ہے' جسے ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ یہ دو قوتیں ہیں جو اندر سے کھینچ رہی ہیں۔ یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے' جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی ﷺ سے شرارِ بولہبی

تاریخ میں جو خیر و شر نظر آ رہا ہے انسان کے باطنی خیر و شر کا مظہر ہے۔ اس حوالے سے جدید ماہرین نفسیات کے کام کا مطالعہ بھی مفید ہے۔ فرائڈ کے بعد نفسیاتِ جدیدہ کے میدان

(۱) یہ ایسا اتصال ہے کہ اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اسے کسی پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا..... ہاں مگر باری تعالیٰ انسانوں کی ارواح کے ساتھ ہے۔

میں کئی نظریات آئے مگر آج بھی اس کے نظریات کو مانا جاتا ہے۔ گویا وہ نفسیاتِ جدیدہ کا باوا آدم ہے۔ فرائڈ نے بڑی وضاحت کے ساتھ انسان شخصیت کے تین levels متعین کیے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک id اور libido ہے' جسے ہم حیوانی داعیات (animal instincts) سے تعبیر کر سکتے ہیں' جو انسان کے اندر سفلی پہلو کا تقاضا بن کر ابھرتے ہیں۔ صحتِ مشاہدہ سے فرائڈ یہاں تک پہنچ گیا جس کا تذکرہ قرآن میں بایں الفاظ آتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس (انسان کا حیوانی وجود) برائی کا حکم دیتا ہے''۔ اسے تو اپنی غرض ہے' اپنا پیٹ بھرنے سے دلچسپی ہے' اسے کوئی غرض نہیں کہ حلال ہے یا حرام ہے۔ اسے اس سے کوئی بحث نہیں کہ دوسرے کا پیٹ خالی ہے یا بھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جنسی جذبہ رکھا گیا ہے جو بڑا منہ زور ہے۔ یہ اپنی تسکین چاہتا ہے' اسے اس سے بحث نہیں ہے کہ حلال راستہ کون سا ہے اور حرام کون سا ہے۔ اس کے اندر ''حُبِّ تفوّق'' (urge to dominate) بھی پائی جاتی ہے' جس کے لیے یہ حلال اور حرام' صحیح اور غلط (fair and foul) کی تمیز بھلا بیٹھتا ہے۔ اسی وجہ سے فرائڈ نفسِ امارہ کے لیے id and libido کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس کے اوپر ایک انسانی شخصیت ہے' حقیقت باطنی ہے' اس کی انا یا خودی (ego) ہے۔ پھر بلند ترین درجے میں اس کی فوق انا یا ماورا خودی (super ego) ہے۔ چنانچہ خیر و شر کی کشمکش انسان کے دونوں وجودوں کے مابین جاری ہے۔ ایک اس کا روحانی وجود ہے اور ایک حیوانی وجود ہے۔ حیوانی وجود خاکی الاصل ہے' جب کہ روحانی وجود کا مبدأ وہ ہے جو ملائکہ کے ہم پلہ ہے' بلکہ ملائکہ سے بھی افضل ہے۔ اس لیے کہ ملائکہ کو تو انسان کے سامنے سجدہ ریز کر دیا گیا۔

انسان کے اندر جو دو وجود ہیں' دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ آج شاید اس بات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے' لیکن اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس روح کے لیے جسد حیوانی درحقیقت قید خانہ ہے۔ جسد پر روح کا غلبہ ہو جائے تو پھر پوری دنیا بندۂ مومن کے لیے قید خانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی مکرم ﷺ نے صراحتاً فرمائی ہے: ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ))(۱) ''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت کی مانند ہے''۔

(۱) شعب الایمان للبیهقی' التاسع والثلاثون من شعب الایمان وهو باب فی المطاعم ..... الفصل الثانی فی ذم کثرة الاکل۔

روح ہمارے حیوانی وجود کے پنجرے میں قید ہے اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرنا چاہتی ہے۔ اس کا میلان ربّ کی طرف ہے' اسے اگر تسکین حاصل ہوتی ہے تو ذکرِ ربّ سے ہوتی ہے' اسے اگر انشراح ہوتا ہے تو معرفتِ ربّ سے ہوتا ہے۔ وہ ایک دہکتی ہوئی بھٹی ہے جس کے اندر محبتِ خداوندی جوش مار رہی ہے۔ میں جان بوجھ کر لفظ عشق استعمال نہیں کر رہا' اس لیے کہ یہ لفظ قرآن وسنت میں استعمال نہیں ہوا' فارسی شاعری میں آیا ہے۔ اس کا مفہوم درست ہے' لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم ان اصطلاحات کی طرف رجوع کریں جو کتاب وسنت میں آئی ہیں۔ نئے الفاظ جب بھی آئیں گے اضافی مفہوم لے کر آئیں گے' تاہم عارضی طور پر نئی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہے۔ ہر دور میں جو ذہنی صغریٰ کبریٰ بنتا ہے وہ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ذہنی رابطے اور ابلاغ (communication) کے لیے جدید اصطلاحات کا استعمال کیا جائے۔ لیکن ان کو مستقلاً اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

لفظ عشق مولانا رومؒ نے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر میں رومیٔ ثانی علامہ اقبال نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ جب کہ قرآن وسنت لفظ محبت استعمال کرتے ہیں۔ بہرکیف محبتِ خداوندی کی ایک آگ روح کے اندر ہے۔ اکثر وبیشتر انسانوں کا حیوانی وجود اس روح کو دبائے ہوئے ہوتا ہے' چنانچہ اس کے بھاری بوجھ تلے یہ روح سسکتی رہتی ہے' تڑپتی ہے' بے چینی محسوس کرتی ہے' لیکن ہمارے جسم کے تقاضے' بطن وفرج کے تقاضے' ہماری شہوات' ہمارے اوپر اس طرح مسلط ہیں اور ان ہی پر ہماری توجہ اتنی مرکوز ہے' ان کے لیے ہماری بھاگ دوڑ اس شدت کے ساتھ ہو رہی ہے کہ اپنے دوسرے وجود کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایک طرح سے بالکل نظر انداز (ignore) ہو کر ایک طرف تڑپتی رہتی ہے' ایک عرصہ تک بے چین رہتی ہے' مگر بالآخر ہوتا یہ ہے کہ روح گویا اس مادی وجود کے اندر دفن ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ چلتا پھرتا انسان اس روح کے لیے مقبرہ بن جاتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے لفظ ''تعزیہ'' استعمال کر لیجیے۔ اس لیے کہ تعزیہ چلتا ہے' مقبرہ کسی ایک جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔ یہ انسان روحانی طور پر مر چکا ہے' اس کی روح دفن ہو چکی ہے۔ اب جن آیات کا میں نے شروع میں حوالہ دیا تھا' ان پر غور کر لیجیے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ (الشمس)

''اور قسم ہے نفس کی اور جیسا کہ اُسے اُس نے ٹھیک بنا دیا۔ پھر سمجھ دی اُس کو نافرمانی کی

اور تقویٰ کی۔ تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوارا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے خاک میں ملا چھوڑا۔''

ایک تو اس کا ظاہری مفہوم ہے جو ہر ایک کے سامنے ہے۔ کامیاب ہو گیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا' اس کو سنوار لیا' اس کو رزائل سے پاک کر لیا۔ اور ناکام ہوا جس نے اس کو مٹی میں دبا دیا۔ دَسَّ ' یَدُسُّ کے معنی ہوتے ہیں گاڑ دینے اور دبا دینے کے۔ قرآن مجید میں کفارِ مکہ کے بارے میں آیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ کسی کے گھر بیٹی پیدا ہو جاتی ہے تو اس فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کو ذلت برداشت کرتے ہوئے زندہ رکھوں یا مٹی میں دبا دوں؟ ﴿اَیُمْسِکُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ﴾ (النحل:۵۹) اسی طرح آپ غور کریں کہ فلاح کامیابی کو کہتے ہیں' لیکن یہ لفظ بنا ہے فَلَحَ یَفْلَحُ سے' جس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو پھاڑنا' توڑنا۔ عربی محاورہ ہے: اِنَّ الْحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ ''لوہا لوہے سے کاٹا جاتا ہے''۔ ''فلاح'' جدید عربی میں کسان کو کہتے ہیں کہ وہ اپنے ہل کی نوک سے دھرتی کے سینے کو چیرتا ہے۔ اسی طرح انسان کے مادی وجود کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر ہے۔ لہٰذا اس مادی وجود کو کچھ توڑنا پھوڑنا ہوگا اور اس میں سے اصل حقیقت کو برآمد کرنا ہوگا۔ دراصل لفظ فلاح کے اندر وہ حقیقت مضمر ہے کہ کوئی شے سینے میں کہیں دبی ہوئی ہے۔ سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱﴾ کا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے ''موضح القرآن'' میں بہترین ترجمہ کیا ہے: ''کام نکال لے گئے وہ اہل ایمان''..... جیسے کوئی شے دفن تھی' بند تھی' اس پر غلاف آ چکا تھا' اس پر پردے آ گئے تھے' اسے پھاڑا ہے' توڑا ہے اور اس میں سے اس حقیقت کو برآمد کیا ہے۔ یہ ہے فلاح کی اصل حقیقت۔ اسی طرح ایک جملہ اپنشد میں ہے' جسے میں اکثر quote کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ حکمت کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ((اَلْکَلِمَةُ الْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا))(۱) ''حکمت کی بات تو مومن کی گمشدہ متاع کی مانند ہے۔ وہ اس کا زیادہ حقدار ہے جہاں بھی اسے پائے''۔ چنانچہ اپنشد کا جملہ ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheaths which encompass his real self."

''انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو اُن مادی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے

(۱) جامع الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة .....

جن کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے۔''

اصل حقیقت اس کی رُوح ہے جو اس کے جسدِ خاکی میں پھونکی گئی تھی۔ ذہن میں رکھیے ہمارے اکثر متکلمین کے نزدیک روح ایک ''جسمِ لطیف'' ہے اور جسد ''جسمِ کثیف'' ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ صرف ایک معنوی حقیقت ہو جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ اور یہ معاملہ ہمارے جسم سے ماورا ہے' اس کو ہم نہیں جان سکتے۔ مَیں ایک سادہ سی بات عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہیں کہ ہماری جان کا ہمارے جسم سے کیا تعلق ہے؟ آپ فزیالوجی کی ضخیم سے ضخیم کتابیں پڑھ جائیے' کہیں پتا نہیں چلے گا کہ جان کا تعلق جسم سے کس طور سے ہے' کس عضو سے ہے۔ نیند کا ہمیں آج تک پتا نہیں کہ دماغ کے کس گوشے میں ہے کہ switch on کریں تو آدمی جاگ جائے' off کریں تو آدمی سو جائے۔ یہ سب ہماری پہنچ اور دسترس سے بہت بعید ہے۔ اگر جان کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں تو روح اس سے کہیں لطیف تر حقیقت ہے۔ اس تعلق پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حواشی میں بہت خوب صورت انداز میں یہ فارسی شعر نقل کیا ہے ؎

جاں نہاں در جسم' اُو در جاں نہاں
اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں(۱)

یہ ہے ہمارا روحانی وجود۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہمارا مادی وجود' اس کے تقاضے اور ہمارے سفلی میلانات روح پر چھا جاتے ہیں تو مادی وجود کے اندر روح دفن ہو کر رہ جاتی ہے۔ آگے الفاظ ہیں: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝۱۰﴾ (الشمس) یعنی نامراد ہوا وہ جس نے اپنی روح کو دفن کر دیا۔ ایک اور مقام پر غور کیجیے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۷۹﴾ (الاعراف)

''ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے بہت سوں کو پیدا کیا ہے جہنم کا ایندھن بننے کے لیے۔ ان کے دل ہیں مگر وہ ان سے غور و فکر نہیں کرتے' ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن

(۱) ''روح ہمارے جسم کے اندر پوشیدہ ہے اور وہ (ذاتِ باری تعالیٰ) ہماری روح کے اندر پوشیدہ ہے..... اے وہ جو دو پردوں میں پوشیدہ ہے اے جانِ جاں!''

سے دیکھتے نہیں' اُن کے کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں۔ یہ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے' یہی لوگ غافل ہیں۔''

یہ تعبیر کا ایک انداز ہے۔ یہاں جبر وقدر کی بحث کو ذہن سے ذرا دور رکھئے! اب اس کی تعبیر کیا ہے؟ یہ جہنم کا ایندھن بننے والے انسان کون ہیں؟ ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کون سا سننا ہے جس کی نفی ہو رہی ہے؟ کون سا دیکھنا ہے جس کی نفی ہو رہی ہے؟ کیا ابوجہل اندھا اور بہرا تھا؟ کیا ابولہب اندھا اور بہرا تھا؟ یہ تو بظاہر بڑے سوجھ بوجھ والے اور بھلے چنگے لوگ تھے۔ ابولہب کی تو بڑی بڑی موٹی آنکھیں تھی' بہت سرخ وسفید رنگت تھی' ہر اعتبار سے ایک خوب رو اور خوبصورت انسان —— لیکن قرآن کیوں کہہ رہا ہے کہ یہ اندھے ہیں؟ کون سی ان کی بینائی ہے' کون سی سماعت ہے جو معطل ہو چکی ہے؟ وہ کون سا دل ہے جس پر مہر لگ چکی ہے؟ —— یہ روح کی حقیقتیں ہیں جن کو بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ مر چکی ہیں۔ وہ اب ﴿اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ﴾ (النحل:۲۱) ہیں۔ یہ مُردہ ہیں' زندہ نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ (النمل:۸۰) ''اے نبی ﷺ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے!'' اس آیت کا تعلق خواہ مخواہ سماعِ موتیٰ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ان مُردوں کے بارے میں نہیں کہا جا رہا جو قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جو زندہ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری تعبیر اقبال کے مصرعے میں ہے کہ ع ''رُوح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد''۔ ایک Biological Life تو تھی' ایک حیاتِ حیوانی اندر موجود تھی' لیکن وہ رُوحِ ربانی ختم ہو چکی تھی' سلب ہو چکی تھی' یا وہ مقبرے یا تعزیے کے اندر مدفون تھی۔ ان کے بارے میں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ﴾ ''یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں''۔ یہ انسان نظر آتے ہیں' حقیقت میں چوپائے ہیں۔ یہ دو ٹانگوں پر چلنے والے' انسان کی شکل میں حیوان ہیں۔ اور حیوان بھی کیسے کیسے؟؟

مولانا احمد علی لاہوریؒ اپنا ایک مکاشفہ بیان فرمایا کرتے تھے جسے متعدد حضرات نے ان سے براہِ راست سنا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مولانا کہتے تھے کہ میں نوجوانی کے دور میں لاہور کے کشمیری بازار' جو اُس وقت بڑا گنجان آباد علاقہ تھا' چلا گیا۔ اچانک ایک بزرگ درویش مجھے ملے اور انہوں نے کہا میں کسی انسان سے ملنا چاہتا ہوں' تم مجھے کسی انسان کی خبر دے سکتے ہو؟ (انسانم آرزوست!) اس پر مولانا نے کہا کہ آپ کو انسان نظر نہیں آ رہے؟ بھرا بازار ہے' گاہک ہیں' دکاندار ہیں۔ ان بزرگ نے جذب کی کیفیت میں کہا' میاں! مجھے تو

یہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا۔ ان کا یہ فرمانا تھا کہ بس اچانک مجھے بھی ایسا محسوس ہوا کہ کسی دکان پر کوئی بندر' کسی پر کوئی بھیڑیا بیٹھا ہے اور کہیں کوئی سور چل رہا ہے۔ اصل میں ان کی شخصیتوں کی جو معنوی حقیقت تھی گویا وہ منکشف ہو کر سامنے آ گئی۔ لباس پہنے ہوئے سفید پوش انسان کی حقیقتِ معنوی چھپی ہوئی ہے۔ اصل شخصیت جو مضمر ہے وہ ایک سور کی شخصیت ہے' جس کے اوپر شہوت بری طرح چھائی ہوئی ہے۔ کوئی حریص بندر کی صورت میں ظاہر ہوا' کوئی بھیڑیا ہے جو کاٹنے اور چیرنے کے لیے بے تاب ہے۔ یہ انسان کا معاملہ ہے۔ قرآن مجید نے تو پھر بھی نرم الفاظ استعمال کیے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ ''یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں''۔ اس لیے گئے گزرے ہیں کہ حیوانوں کو تو پیدا ہی اس سطح پر کیا گیا تھا' لہٰذا وہ اس سطح پر ہیں تو ان کے لیے کوئی عار اور شرم کی بات نہیں ہے' مگر انسان کا تو معاملہ یہ ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین) ''تحقیق ہم نے انسان کو بہترین انداز پر تخلیق کیا''۔ وہ احسنِ تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اس پستی میں مبتلا ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بارہا آیا ہے۔ اہم مضامین قرآنِ مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور ملیں گے۔ چنانچہ نوٹ کریں کہ یہی مضمون سورۃ الحج میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (الحج)

''کیا وہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ ہوتے اُن کے دل کہ وہ ان سے سوچتے' یا ہوتے ان کے کان کہ وہ ان سے سنتے؟ پس آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں' دل اندھے ہو جاتے ہیں۔ ابوجہل کی آنکھ اندھی نہیں تھی' دل اندھا تھا۔ یہ ہے روحانی وجود کی حقیقت جس کے لیے امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''ملکیت'' اور ''بہیمیت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کا شعر ہے ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں[1]

(۱) اولادِ آدم عجب معجون مرکب ہے..... اس میں فرشتوں والی صفات بھی ہیں اور حیوانوں والی بھی!

انسان کی شخصیت کے دو رُخ ہیں‘ اس میں ملکیت بھی ہے اور بہیمیت بھی ہے۔ اس میں حیوان بھی ہے‘ فرشتہ بھی۔ لیکن جب وہ حیوان غالب آجاتا ہے اس طور سے کہ فرشتے والی صفت دفن ہو جاتی ہے تو پھر وہ انسان وجود میں آتے ہیں جو غالب اکثریت میں نظر آرہے ہیں۔ دوسری جانب اس دلدل سے نکلنے کے لیے سورۃ التین میں فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶﴾ ’’سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے‘ پس اُن کے لیے اجر ہے بے حساب۔‘‘

سلوکِ قرآنی کے تین مراحل

اگر شعور‘ ہوش‘ توجہ اور تنبہ ہو جائے تو اب تین مراحل ہیں جن سے گزرنا ہوگا۔

(۱) مجاھدہ مع النفس: سلوکِ قرآنی کا سب سے پہلا مرحلہ مجاہدہ مع النفس کا ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ اصل شے ہماری باطنی کشمکش اور ہمارے نفس کی امّارۃ بالسُّوء ہونے کی کیفیت ہے۔ یہی ہے جو لوگوں کی اس ہلاکت کا باعث ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے حقیقت کے اعتبار سے مردہ ہیں‘ اس لیے کہ ان کی باطنی صلاحیت سلب ہو چکی ہے اور وہ اب حیوانوں کا سا دیکھنا دیکھ رہے ہیں اور حیوانوں کا سا سننا سن رہے ہیں۔ انسانی دیدن اور انسانی شنیدن انہیں حاصل نہیں۔ اسی لیے اقبالؔ نے کہا ہے ؎

دم چیست؟ پیام است! شنیدی نہ شنیدی؟
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است! ندیدی؟
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

اقبالؔ ہی نے کہا تھا ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

چنانچہ پہلا مرحلہ ہے مجاہدہ مع النفس۔ اس کے لیے تین اصلاحات ذہن میں ٹانک لیجیے: ۱۔ضبطِ نفس‘ ۲۔تہذیبِ نفس‘ ۳۔تزکیۂ نفس۔ اس روح کو اگر پروان چڑھانا ہے‘ اگر اس کی ترقی پیشِ نظر ہے‘ اگر چاہتے ہیں کہ یہ بیدار ہو‘ اسے تقویت پہنچے‘ ہمارے وجود پر غالب آئے تو اس کو اتنا قوی اور توانا کرنا ہوگا کہ یہ نفس پر قابو یافتہ ہو جائے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے بزرگ دیتے چلے آئے ہیں کہ جسم درحقیقت مرکب (سواری) ہے‘ جبکہ ہمارا روحانی وجود‘

ہماری انا' یا علامہ اقبال کے فلسفے کے مطابق ہماری خودی راکب ہے' یہ گھوڑے کے اوپر سوار ہے اور یہ گھوڑا بہت منہ زور ہے۔ اگر راکب کمزور ہو تو وہ گھوڑے کے رحم وکرم پر ہے' وہ جدھر چاہے اسے لے جائے اور جس کھائی میں چاہے پٹخ دے۔ لیکن اگر راکب (سوار) تقویت پا گیا ہے' مضبوط ہے' توانا ہے' جما بیٹھا ہے تو پھر گھوڑا اس کے لیے سرمایہ (asset) ہے۔ وہ اسے استعمال کرے گا' خیرات وحسنات اسی کے ذریعے سے کمائے گا' اسی کے ذریعہ اکتساب اعمال کرے گا' اور یہی استعداد ہے جو اس کے بروئے کار آئے گی۔ یہ اُس گھوڑے کی مانند ہے جس پر آپ سوار ہو کر منزلِ مقصود کی طرف چلے جا رہے ہیں' بشرطیکہ اس پر آپ کا کنٹرول ہو۔ اور اگر صورت برعکس ہو جائے اور گھوڑا آپ پر قابو پا لے' چونکہ آپ کمزور ہیں تو پھر آپ کا جو حشر ہوگا وہ سب کو معلوم ہے۔ یہ ضبطِ نفس' تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس اسی لیے ہیں کہ روح کا جسم پر کنٹرول رہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾﴾ (النزعت)

''اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے اور روکتا رہا اپنے نفس کو خواہشات سے' تو جنت ہی اُس کا ٹھکانہ ہے۔''

اور حدیثِ رسول ﷺ میں وضاحت ہے کہ:

((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ))(۱)

''اصل ہوشمند اور باشعور وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس کو قابو میں رکھیں۔ (اسے اپنا محکوم اور مطیع بنائیں) اور عمل کریں موت کے بعد والی زندگی کے لیے۔''

اس حوالے سے عبادات کی پابندی بہت ضروری ہے۔ پہلی عبادت نماز ہے جو اسلام کا رکن ہے اور ایمان کی تجدید وآبیاری کا اور غفلت سے بچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ پانچ وقت ماحول سے نکل کر عہد کو تازہ کرو۔ اپنے پروردگار کے حضور سجدے میں گرو' لوحِ جبیں تازہ کرو' اپنا عہدِ بندگی استوار کرو: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۵﴾﴾ ''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔''

---

(۱) جامع الترمذی' کتاب صفة القيامة والرقائق والورع ..... باب ماجاء فی صفة اوانی الحوض..... و کتاب الزهد لاحمد بن حنبل۔

تزکیۂ نفس کے حوالے سے دوسری اہم عبادت روزہ کی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ باقی تمام نیکیوں کا بدلہ تو دس سے ستر گنا تک ملے گا' لیکن ((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ))(۱) ''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا''۔ عبادات میں اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ نفس کو لگام دینے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ یہ ضبطِ نفس اور تہذیبِ نفس کا بہترین طریقہ ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ((اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ)) ''روزہ ڈھال ہے''۔ نفس کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے تو روزے کی ڈھال اپنے ہاتھ میں لو۔

مزید برآں تزکیۂ نفس کے لیے مؤثر ترین شے انفاقِ مال ہے۔ میں اس بارے میں اپنا احساس آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دوسری عبادات کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دے لیکن بخل اس کے اندر رہ گیا' مال کی محبت رہ گئی تو یہ بات قرآن وسنت کے واضح نصوص سے معلوم ہوتی ہے کہ تزکیہ نہیں ہوا۔ محض دھوکا اور فریب ہے جسے تزکیہ سمجھا جا رہا ہے۔ کسی کو مشکل میں دیکھ کر اگر دل سے مدد کرنے کا جذبہ نہیں ابھرتا تو ابھی تزکیۂ نفس کی منزل بہت دور ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ یُحْرَمُ الرِّفْقَ یُحْرَمُ الْخَیْرَ کُلَّہٗ))(۲) ''جو شخص دل کی نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ کُل کے کُل خیر سے محروم کر دیا گیا''۔ اس لیے کہ نفس کی اصل بیماری ''حُبِّ دُنیا'' اور اس کی علامت ''حُبِّ مال'' ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾ (الیل) ''اور جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا' اور جھوٹ جانا اور جھٹلایا نیکی کو' سو اُس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں''۔ قرآن نے یونہی نہیں کہہ دیا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾ (آل عمران) ''تم نیکی کی حقیقت کو اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک خرچ نہ کرو اُس میں سے جسے محبوب رکھتے ہو' اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اللہ تبارک وتعالیٰ اُسے جاننے والا ہے''۔ علاوہ ازیں آیت البِرّ میں فرمایا گیا:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ

(۱) صحیح البخاری ۔ وصحیح مسلم ۔ وجامع الترمذی' کتاب الصوم' باب ما جاء فی فضل الصوم۔

(۲) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب فی الرفق۔

وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ (البقرۃ)

''بلکہ اصل نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' یومِ آخر پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اُس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' یتیموں کو' محتاجوں کو' مسافروں کو' سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کرلیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعۃً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقۃً متقی ہیں۔''

یہاں نماز اور زکوٰۃ کو علیحدہ اور ایتائے مال کو علیحدہ ذکر کیا گیا۔ ''خرچ کرو اللہ کی راہ میں!'' یہ ہے اصل میں تزکیۂ نفس کا مؤثر ترین ذریعہ' اور اگر خدانخواستہ اس سے صرفِ نظر کیا گیا تو مطلوب حاصل نہیں ہوگا۔ ہر عبادت کی اپنی تاثیر ہے۔ ان عبادات میں اپنی اپنی نورانیت ہے' ہر ایک کی اپنی افادیت ہے۔ لہٰذا اگر ایتائے مال کو By pass کر دیا گیا' اگر حُبِ مال کی کیفیت جوں کی توں رہی' اگر بخل باقی رہا' ﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾﴾ (الھمزۃ) ''جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا'' کی کیفیت برقرار رہی تو یہ وہ bottle neck ہے جو انسانی شخصیت کے ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کو قرآن مشکل گھاٹی سے تعبیر کرتا ہے:

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾﴾ (البلد)

''پھر بھی وہ اس گھاٹی کو عبور نہ کر سکا' اور تمہیں کیا پتا کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔ کسی کی گردن چھڑا دینا' یا پھر کسی بھوک والے دن میں کھانا کھلا دینا' کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی مسکین کو جو مٹی میں رُل رہا ہو۔''

اگر یہ کام نہیں کر سکے تو دوسری عبادات کے ڈھیر کے ڈھیر بھی تلافی نہیں کر سکتے۔ ہر عبادت کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے' نمازیں آپ لاکھوں کروڑوں پڑھ لیں' فرض روزے کا قائم مقام کوئی نماز نہیں بن سکتی۔ اسی طرح نماز اور روزہ آپ کتنا ہی کرلیں زکوٰۃ کے وہ قائم مقام نہیں بن سکتے۔ زکوٰۃ فرض ہے اور زکوٰۃ ہی دی جائے گی تو فرض ادا ہوگا۔ ہر شے کا

اپنا مقام ہے۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے' وہ اصل میں تجدید ایمان کا مؤثر ترین ذریعہ ہے' ذکر اور یاددہانی ہے۔ اس کے بعد روزہ نفس کے تقاضوں کو لگام دینے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی نفس کا سب سے بڑا رذیلہ مال کی محبت ہے اور اس کا علاج ''انفاق فی سبیل اللہ'' ہے۔ یہ ہے وہ جامع پروگرام جس سے یہ مجاہدہ مع النفس ہوگا۔ اس سے آپ نفس کے منہ زور گھوڑے کو لگام دیں گے۔ اس سے گویا آپ کا پہلا مرحلہ طے ہو گیا۔

(۲) حُبِّ ربّ : دوسرا مرحلہ ''حُبِّ ربّ'' یعنی پروردگار کی محبت ہے۔ جب آپ نے اپنے نفسِ امارہ کو لگام دے دی' اس کے جو رذائل ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا تو اب آپ کے روحانی وجود کو جو ریلیف (relief) میسر آیا ہے' وہ اپنے رب کی جانب متوجہ ہوگا۔ چنانچہ غور کیجیے سورۃ البقرۃ کے تیئیسویں رکوع میں احکامِ صوم والی آیات کے فوراً بعد یہ آیت آ رہی ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾

''اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں تو قریب ہی ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے میں اُس کی پکار کو سنتا ہوں' تو چاہیے کہ وہ میرا کہا مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں' تاکہ وہ راہِ راست پر آ جائیں۔''

اب یہ روح کو ریلیف ملا ہے' نفس کا بوجھ اس پر سے کم ہوا ہے' وہ دباؤ جس کے نیچے وہ سسک رہی تھی اس سے رستگاری ملی ہے تو وہ اپنے ربّ کی طرف متوجہ ہوگی۔ اب وہ جذبہ جو اس کے اندر متوارث (inherent) موجود ہے' وہ بروئے کار آئے گا۔ یعنی ع ''اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن'' اور جو کہا گیا ہے: كُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ (ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے)۔ اس روح کا اصل تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے[1]۔ اس کے اندر

(۱) اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحبؒ علامہ اقبال کی یہ رُباعی سنایا کرتے تھے:

مرا دل سوخت بر تنہائی او	''میرا دل جلتا ہے اُس کی تنہائی پر
کنم سامانِ بزم آرائی او	اُس کی بزم آرائی کے لیے سامان کر رہا ہوں
مثالِ دانہ می کارم خودی را	بیج کی طرح خودی کو پال رہا ہوں
برائے او نگہدارم خودی را	اُس کے لیے خودی کی نگہبانی کر رہا ہوں''۔

اور Plotinus کا قول ہے: ''Flight of alone to the alone''۔
تفصیل کے لیے دیکھیے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی سورۃ الحدید کی تفسیر پر مبنی کتاب ''اُمّ المسبّحات'' (مرتب)

ایک شوقِ لقاء بھی ہے' ایک محبت کا جذبہ بھی ہے' لیکن نفس کے تقاضوں کے تحت دبا ہوا ہے' جو اب تک ظاہر نہیں ہوا' اب وہ ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس کو قرآن مجید کہتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرة: ١٦٥) ''اور اہلِ ایمان اللہ کی محبت میں سب سے بڑھ کر ہیں''۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ کی محبت کا ذکر آئے تو سمجھ لیجیے کہ اس کے اندر رسول ﷺ کی محبت کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ وہاں مضمر ہے' اس کو ظاہر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دو اعتبارات سے اللہ اور اُس کا رسول ﷺ ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ اطاعت کے اعتبار سے اور محبت کے اعتبار سے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

(آل عمران)

''کہہ دیجیے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (ﷺ) کی' پس اگر تم رُوگردانی کرو گے تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا''۔

جبکہ سورۃ التوبۃ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے (اے نبی ﷺ!) اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور خاندان اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں تمہیں مندے کا خدشہ رہتا ہے اور وہ گھر جو تمہیں بڑے پسند ہیں' تم کو زیادہ محبوب ہیں اللہ سے' اُس کے رسول سے اور اُس کے راستے میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے' اور اللہ ہدایت نہیں دیتا نافرمانوں کو''۔

معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے شدید ترین محبت اور اللہ سے ملاقات کا شوق واشتیاق مطالباتِ دین میں سے ہے۔ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے انتقال کے وقت کی کیفیت ذہن میں رکھیے۔ آپ کو معلوم ہے انبیاء ورسل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے انتقال سے متصل قبل فرمایا:

((لَنْ یُقْبَضَ نَبِیٌّ قَطُّ حَتّٰی یَرٰی مَقْعَدَہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ ثُمَّ یُخَیَّرُ))(۱)
''کوئی پیغمبر اُس وقت تک وفات نہیں پاتا جب تک بہشت میں اپنا ٹھکانا نہیں دیکھ لیتا' پھر اس کو اختیار دیا جاتا ہے (اگر چاہے تو دنیا میں مزید رہے یا مراجعت اختیار کرے۔)''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس پر رو پڑے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے تھے کہ کیا معاملہ ہے؟ دراصل بندۂ مومن کے لیے یہ ایک بڑی لطیف حقیقت ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں رہنے پر کبھی راضی نہیں ہوتا۔ یہ ''سِجْنُ الْمُؤْمِن'' ہے۔ یہ اس کے لیے liability ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کسی CSP آفیسر کو بلوچستان کے دور دراز کونے میں کہیں پر لگا دیا جائے۔ چلا تو وہ جائے گا کہ ملازمت کا تقاضا ہے مگر مستقلاً رہنے پر راضی نہیں ہوگا۔ دنیا میں رہنا اللہ کے حکم سے ہے۔ یہ ہمارے لیے place of duty ہے۔ جب تک بھی اللہ ہمیں یہاں رکھے یہاں رہنے پر راضی رہنا ہے' مگر یہاں زندگی کی طوالت کی آرزو یا تمنا نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن میں یہودیوں کا وصف بیان ہوا ہے: ﴿یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ﴾ (البقرہ:۹۶) ''اُن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کاش اُسے ہزار سال کی عمر دے دی جائے''۔ اس کے برعکس بندۂ مومن کی شان تو وہ ہے جو اقبال نے بیان کی کہ ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست(۲)

آخری کلمات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے وہ یہ تھے: ((اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی))(۳) ''اے اللہ! اے بلند ترین رفیق!''

گویا جو وقت بھی یہاں گزرا ہے وہ ایک فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے تھا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو روحانی اور قلبی تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تھا' ہمارے لیے تو وہ تصور سے ماورا ہے۔ لیکن دنیا میں رہتے ہوئے کوئی لطیف حجاب تو تھا' کوئی پردہ تو تھا نا۔ وہ بھی اتنا شاق گزر رہا ہے! یہ ہے محبت' یہ ہے شوقِ لقاء! اللہ سے ملاقات' اس کے حضور حاضری کا شوق

(۱) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب دعاءِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
(۲) ''مردِ مؤمن کی نشانی میں تمہیں بتاؤں؟..... جب موت آتی ہے تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔''
(۳) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی۔

واشتیاق۔ اگر یہ نہیں ہے تو ایمان کی اصل لذت اور روح کی حیاتِ باطنی کا ابھی کوئی احساس تک نہیں ہے۔ ان روحانی کیفیات کا تو مزا ابھی چکھا ہی نہیں اُس شخص نے جس میں یہ محبتِ خداوندی ایک زندہ حقیقت قرار نہیں پائی۔ یہ حرارت اگر اس کے باطن کے اندر نہیں ہے تو وہ باطنی کیفیات سے عاری ہے۔

لا الٰہ اِلاّ اللہ کا مفہوم: صوفیاء کرام نے ''لا الٰہ اِلاّ اللہ'' کا جو مفہوم بیان کیا ہے صد فیصد درست ہے۔ توحید کی ایک سطح وہ ہے جس پر عوام ہوتے ہیں' وہ اس سے اُوپر نہیں جا سکتے۔ ان کے لیے ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مفہوم یہ ہے کہ ''لا معبود اِلا اللہ..... لا رازق اِلا اللہ''..... یعنی کوئی معبود نہیں' کوئی رازق نہیں' کوئی مشکل کشا نہیں' کوئی حاجت روا نہیں سوائے اللہ کے''۔ یہ توحید کا پہلا درجہ ہے۔ لیکن اس سے اگلی منزل جہاں سے روح کی حیاتِ باطنی کا آغاز ہوتا ہے وہ ہے ''لا محبوب اِلا اللہ..... لا مطلوب اِلا اللہ..... لا مقصود اِلا اللہ''..... یعنی مقصود' مطلوب اور محبوبِ حقیقی کے درجے میں اللہ کے سوا کوئی نہ رہے۔ کوئی بھی اس مقام پر موجود ہے تو یہ شرک کی ایک قسم ہے۔ اگر کوئی بھی محبت اس محبت کے برابر براجمان ہوگئی تو یہی تو ہے جو اقبال نے کہا ہے۔

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

یہ ہیں درجۂ احسان کے ثمرات۔ یہی وہ ثمرات ہیں جن کو ہمارے دین کی اصطلاح میں ''ولایت باہمی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ اللہ اور اُس کے بندے کی باہمی دوستی ہے۔ اللہ بھی ولی ہے اہل ایمان کا' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ''اللہ دوست ہے اہل ایمان کا' نکالتا ہے اُنہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔ اور یہ جو واقعی حقیقی ایمان رکھنے والے ہیں' جن کے قلوب میں اور جن کی شخصیتوں میں ایمان رچ بس گیا ہے تو وہ اللہ کے دوست ہیں۔ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (یونس) ''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف لاحق ہوتا ہے نہ حزن۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا''۔ انہیں خوف و حزن اس لیے نہیں ہے کہ وہ راضی برضائے رب ہیں ع ''ہر چہ ساقیٔ مارینخت عین الطاف است'' (جو کچھ میرے ساقی نے

میرے پیالے میں ڈال دیا وہی عین لطف وکرم ہے۔) وہ اس کشمکش اور پیچ وتاب میں مبتلا نہیں ہوتے کہ یوں ہونا چاہیے تھا' یوں کیوں ہوگیا؟ یہ کس نے کردیا اور یہ مجھ پر کس نے ظلم ڈھادیا؟ بلکہ ''ماشاء اللّٰہُ کان وما لم یشأ لم یکن'' (جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہوا۔) حدیث میں آیا ہے کہ تمام انسان مل کر اگر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو' اور تمام انسان مل کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو۔ تو کس کا خوف' کس سے امید' کس کا ڈر' کس بات کا حزن؟ جو ہوا اللہ کا فیصلہ اسی میں تھا: ؎

بروں کشید زپیچاکِ ہست وبود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا(۱)

یہ مقامِ رضا ہے۔ یعنی دوست کی رضا پر راضی رہنا ہے' جو اُس کا فیصلہ ہو قابلِ قبول ہے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے تن من دھن لگا دینا اپنی جگہ ضروری ہے' لیکن اس میں بھی توکل صرف اللہ پر ہو کہ ہمارے کیے کچھ نہیں ہوگا' محنت کرنا ہماری ذمہ داری ہے' نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ علاج کرنا سنت ہے' کریں گے' لیکن شفاء دوا میں نہیں' اللہ کے اذن میں ہے۔ ہماری بھوک غذا سے نہیں مٹتی' اللہ کے اذن سے مٹتی ہے۔ پیاس پانی سے نہیں بجھتی' اللہ کے حکم سے بجھتی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَۃِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ'' (اللہ کے سوا کوئی فاعلِ حقیقی' کوئی مؤثرِ حقیقی نہیں۔) تو یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ ہر فعل کے اندر دو اجزاء (components) ہیں۔ انسان ''کاسبِ اعمال'' ہے' جبکہ ''خالقِ اعمال'' اللہ ہے۔ چنانچہ انسان کے لیے ہر فعل پر اپنی نیت کے اعتبار سے اجر وثواب یا عذاب وسزا ہے۔ لیکن ہوگا وہی جس میں اذنِ رب ہوگا۔

اسی طرح ''باہمی مذاکرہ'' ہے' تم اللہ کو یاد رکھو' اللہ تمہیں یاد رکھے گا: ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۲) ''تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ حدیث قدسی ہے کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ میرا بندہ اگر مجھے محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اُس کا اس سے اعلیٰ محفل میں ذکر کرتا ہوں یعنی ملائکہ مقربین کی

(۱) ہست وبود کی الجھنوں سے مجھے باہر نکال دیا..... کتنے ہی عقدے تھے جو مقامِ رضا کے حاصل ہوجانے سے حل ہوگئے۔

محفل میں۔ میرا بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ یہ ہے باہمی تعلق۔ اسی طرح نصرتِ باہمی کا معاملہ ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ تم اس کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ' اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں تن من دھن لگاؤ' اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ تو یہ ہے درحقیقت محبت باہمی اور ولایتِ باہمی کا ایک ایسا تعلق جو ایمان کا لُبِّ لُباب اور حاصل ہے۔ ایمان جب اس درجے کو پہنچ جائے کہ آپ کے احساسات میں' آپ کے نقطہ نظر میں' آپ کی باطنی کیفیات میں یہ تبدیلی واقع ہو جائے تو یہ ہے ایمان کا حاصل!

نصبُ العین

اسی بات کو ایک بہت عظیم' مضبوط اور مدلل فلسفے کی حیثیت سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ''Manifesto of Islam'' میں پیش کیا ہے[1]۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی قرآن کی نصوص کی روشنی میں تشریح وتوضیح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر سب سے بڑا جذبہ محبت کا جذبہ ہے۔ وہ کسی شے سے' کسی ہستی سے یا کسی نظریے اور خیال سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے بھوکا رہنا گوارا کرتا ہے۔ اس کی جبلت میں تو یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹ کو بھرے' اپنی ذات کی بقاء (preservation of the self) کے تقاضے پورے کرے۔ لیکن اگر مقصد زندگی کی لگن چھا جائے تو انسان فاقے برداشت کرتا ہے۔ یہ جذبہ کسی بھی مقصد کے لیے بروئے کار آ سکتا ہے' وطن کے لیے' قوم کے لیے' کسی نظریے کے لیے' جیسے ماضی میں کمیونزم وغیرہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

حیوانی جبلت (animal instinct) تو یہ ہے کہ اپنی جان کو بچایا جائے' لیکن انسان کو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی محبوب شے کے لیے جان قربان کر دیا کرتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں' جیسے جاپانیوں نے جنگ عظیم میں کیا کہ چھاتہ بردار بم باندھ کر ہوائی جہاز سے کودے اور بحری جہاز کی چمنی میں اتر گئے۔ انہیں معلوم ہے کہ خود ان کے پرخچے اڑ جاتے ہیں مگر ان پر وطن کی محبت چھائی ہوئی ہے۔ انسان کا کوئی نہ کوئی مطلوب ہو' کوئی آدرش ہو' کوئی نصب العین ہو'

---

(۱) اس کا ترجمہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے ''منشورِ اسلام'' کے نام سے کیا ہے' جو ''حکمت قرآن'' میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے اور اب کتابی صورت میں دستیاب ہے۔ (مرتب)

کوئی آئیڈیل ہو' کوئی اس کا محبوب ہو' کوئی اس کا مقصود ہو' اس کے لیے وہ محنت کرے' ایثار کرے' اس کے لیے وہ بھوکا رہے' اس کے لیے وہ راتوں کو جاگے' اس کے لیے وہ جان کا رِسک لے' جان قربان کر دے' اس کے لیے وہ پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈالے' یہ انسان کا بلند ترین اور سب سے زیادہ قوی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ اصل میں اللہ کی محبت کے لیے پیدا کیا گیا ہے' لیکن فکری پستی کی وجہ سے انسان معرفتِ رب تک نہیں پہنچ پاتا۔ تو جیسے شدید بھوک میں آپ کسی گھٹیا غذا کو بھی قبول کر لیں گے جسے عام حالات میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے' آپ اس کو اضطرار کی حالت میں کھا لیں گے' اسی طرح جب انسان کی نگاہ اُس بلند ترین مطلوب و مقصود تک' اُس highest ideal تک' اُس اصل محبوبِ حقیقی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کسی اور شے کو اُس کی جگہ رکھ کر اس سے وہی محبت کرنے لگتا ہے جو دراصل اللہ سے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اندر کے جذبہ کو تسکین (satisfaction) درکار ہے۔ اُسے تو کوئی نہ کوئی محبوب چاہیے۔ اگر خدا تک نہیں پہنچے گا تو کسی اور شے کو پوجے گا' وطن کو پوجے گا' قوم کو پوجے گا' اپنے ہی نفس کو پوجے گا' اپنے ہی ''حریم ذات'' کے گرد طواف کرتا رہے گا۔ ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رُست از یک بندتا افتاد در بندے دگر(۱)

اور ؎

اک تصور کے حسنِ مبہم پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے!

اگر وہ آرزو نہیں رہی' وہ امنگ نہیں رہی' کوئی نصب العین نہیں' کوئی آدرش نہیں' کوئی مطلوب و مقصود نہیں تو پھر یہ انسان محض ایک ''human vegetable'' ہے۔ یہ اصطلاح (human vegetable) آج کل بہت استعمال ہوتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو طبعی طور پر مر چکے ہوں لیکن ان کو مشینوں سے زندہ رکھا گیا ہو کہ دل بھی چل رہا ہے' خون بھی گردش میں ہے اور گردوں کے لیے بھی مشین کام کر رہی ہے' وغیرہ۔ یہ لوگ سالہا سال تک اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔

الغرض یہ ہے وہ فلسفہ جو قرآن مجید میں سورۃ الحج کے آخری رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾ ''بہت ہی کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی!'' طالب و مطلوب کا ایک باہمی تعلق (relation) ہوتا ہے۔ انسان کسی بلند شے کو مطلوب

(۱) ہمارا فکر ہر دم نیا خدا تراشتا رہتا ہے..... ایک الجھن سے نکلتا ہے تو دوسری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔

ومقصود بنا تا ہے تو اُس کی اپنی شخصیت بھی بلند ہوتی ہے' لیکن جب اس کی نگاہ پستی پر اٹک جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی شخصیت بھی انتہائی پست رہ جاتی ہے۔ بلند آئیڈیل ہوگا تو اس کی شخصیت کو ترفع حاصل ہوگا۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو ایک اونچی دیوار پر چڑھنا ہے' کمند آپ کے پاس ہے تو آپ کو اپنے زورِ بازو کے ذریعے پہلے کمند کو اونچا پھینکنا ہوگا۔ جتنی اونچی کمند اٹک جائے گی' اتنا ہی اونچا آپ جاسکیں گے۔ جتنا آپ کا آئیڈیل بلند ہوگا' اتنی ہی آپ کی شخصیت میں بلندی ہوگی۔ قرآن مجید میں جہاں فرمایا گیا کہ اہل ایمان کی شان تو یہ ہے کہ شدید ترین محبت اللہ سے کرتے ہیں' وہاں انسان کی مجبوری اور پستی کے اندر مبتلا ہونے کا ذکر بھی کیا گیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو مدمقابل بنا لیتے ہیں' پھر اس سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے' اور وہ لوگ جو اہل ایمان ہیں وہ شدید ترین ہیں اللہ کی محبت میں۔''

محبوبِ حقیقی اللہ کو ہونا چاہیے تھا' لیکن وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو اس مقام پر کسی اور کو رکھ کر اس کو پوجنا شروع کر دیا' اس سے محبت شروع کر دی۔ یہ انسان کا فطری تقاضا ہے' جس کو وہ ہر صورت پورا کرتا ہے' کسی نہ کسی شے کو اپنا مطلوب و مقصود بنا کر۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ع ''یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!'' (کمند کی تشبیہ میں نے یہیں سے لی ہے۔) تمہاری کمند نیچے نہ کہیں اٹک کر رہ جائے' اپنی کمندِ آرزو' اپنی کمندِ طلب کو اتنا اونچا پھینکو کہ وہ ذات باری تعالیٰ تک تمہیں پہنچا سکے۔ ع ''منزلِ ما کبریا است!'' ہمارا مطلوب و مقصود ذات باری تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔

ایک غلطی کی اصلاح: یہاں ایک چھوٹا سا نکتہ مزید واضح کر دوں۔ بعض دینی جماعتوں کے ہاں لفظ ''نصب العین'' غلط طور پر استعمال ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجہد اور اللہ کے دین کی سربلندی کی کوشش ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ دراصل نصب العین صرف اور صرف اللہ اور اس کی رضا ہے۔ البتہ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کو بجالانا ہے۔ نماز پڑھنا فرض ہے' پڑھنی ہے۔ روزہ رکھنا فرض ہے' اس کو رکھنا ہے۔ روزہ نصب العین نہیں ہے' نصب العین

اللہ کی رضا ہے۔ سوائے اللہ کی رضا کے کسی شے کو نصب العین کے درجے میں لانا درست نہیں۔ اگر کسی درجے میں لانا بھی چاہیں تو ''فلاحِ اُخروی'' کا لفظ استعمال کرلیں۔ لیکن کسی شے کو فرائض کی فہرست میں سے بلند کر کے نصب العین بنا دینا فکری غلطی ہے' اور پھر اس فکر کے نتائج بہت دور رس نکلتے ہیں۔ اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے' اس کی کوشش ہمارے ذمہ ہے' تمام شرائط ولوازم کے ساتھ' لیکن اقامت دین ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ یہ من جملہ دوسرے فرائضِ دینیہ کے ایک اہم ذمہ داری ہے۔

(۳) تقرب الی اللہ: اس سلوکِ قرآنی کا تیسرا مرحلہ تقرب الی اللہ ہے۔ یہ تقرب الی اللہ کوئی زمانی یا مکانی سفر نہیں ہے۔ صرف یہی ہے کہ جو حجابات طاری ہیں وہ اُٹھتے چلے جائیں اور قربِ معنوی اللہ سے حاصل ہو جائے۔ یہ فاصلہ زمین پر طے نہیں کرنا ہے' یا خلا میں کروڑوں میل جا کر اللہ سے قرب حاصل کرنا اس کا مفہوم نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ انسان کا اللہ کے ساتھ ربطِ معنوی مزید پختہ اور گہرا ہو جائے۔

تقرّب الی اللہ کے دو راستے

اب اس کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ دنیا میں یہ رہا ہے کہ مجاہدہ مع النفس ہی کے اندر شدید غلو کیا جائے۔ اس کے ذریعہ انسان ضبطِ نفس (self control) تک نہیں بلکہ نفس کُشی (self annihilation) تک پہنچ جاتا ہے۔ اسے رہبانیت کہتے ہیں' جس میں تجرد کی زندگی ہے' جس میں دنیا سے انقطاع ہے' جس میں ترکِ دنیا ہے۔ اس میں ذکر کی انتہائی کثرت کے ساتھ مسلسل روزے اور شدید سے شدید تر چلّے ہیں۔ کئی کئی دن کے روزے چل رہے ہیں۔ روزہ نہ بھی ہو تو پابندی ہے کہ نہ کچھ کھانا ہے اور نہ کچھ پینا ہے۔ یہ دنیا کی تاریخ میں ایک بڑا طویل باب ہے' جو آپ کو ہر دور میں ہر جگہ روحانیت کے نام پر نظر آجائے گا' جس کا جامع عنوان ہے ''رہبانیت''۔ جان لیجیے یہ راستہ اسلام کا نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں بھی اس کا ایک عکس در آیا ہے۔ الحمد للہ! ہمارے ہاں خانقاہی نظام میں بالکلیہ وہ نظام تو نہیں آیا لیکن اس کا ایک عکس ضرور پیدا ہوا ہے۔ قرآن نے تو رہبانیت کی پرزور نفی کی ہے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ (الحدید:۲۷)

''اور انہوں (عیسائیوں) نے رہبانیت کا طریقہ خود ایجاد کرلیا تھا' ہم نے تو اُن پر یہ بات لازم نہ کی تھی' مگر وہ اس سے اللہ کی رضا چاہتے تھے' پھر نہ نبھایا اُس کو جیسا کہ اُس کا حق تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک انداز میں فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ))(۱) ''اسلام میں کو رہبانیت نہیں ہے''۔ نیز فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ))(۲) ''نکاح میری سنت ہے''۔ آپ نے ان رجحانات کی اول روز ہی سے اصلاح فرمائی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور ﷺ کو خبر دی گئی کہ ساری رات نماز میں کھڑے رہتے ہیں' کمر بستر سے لگاتے ہی نہیں' بیوی سے کوئی سروکار نہیں' تمام دن روزہ رکھتے ہیں اس پر حضور ﷺ نے انہیں بلا کر استفسار فرمایا:

((اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ؟)) قُلْتُ: اِنِّيْ اَفْعَلُ ذٰلِكَ' قَالَ: ((فَاِنَّكَ اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ هَجَمَتْ عَيْنُكَ' وَنَفِهَتْ نَفْسُكَ' وَاِنَّ لِنَفْسِكَ حَقًّا' وَلِاَهْلِكَ حَقًّا' فَصُمْ وَاَفْطِرْ' وَقُمْ وَنَمْ))(۳)

''(اے عبداللہ!) یہ میں کیا سنتا ہوں' تم رات بھر قیام کرتے ہو اور دن بھر روزہ رکھتے ہو؟ (حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا: جی ہاں' ایسا ہی کرتا ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ایسا مت کرو! اس لیے کہ) جب تم یہ طرزِ عمل اختیار کرو گے تو تمہاری آنکھیں بوجھل ہو جائیں گی اور تم تھک جاؤ گے۔ یقیناً تمہاری جان کا بھی حق ہے اور تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے' چنانچہ روزہ رکھو بھی اور نہ بھی رکھو اور رات کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔''

یہ تشدد' یہ غلو' اس کے اندر ریاضت کی شدت' جو دنیا میں رہبانی نظام کا جزو رہا ہے' حضور ﷺ نے سختی کے ساتھ اس رجحان (tendency) کو کم کیا ہے۔

اسی طرح مشہور واقعہ ہے کہ تین صحابہؓ میں یہی جذبہ اُبھرا' انہوں نے آ کر نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے آپ ﷺ کی نفلی عبادات سے متعلق معلوم کیا کہ حضور ﷺ ہر مہینے کتنے

---

(۱) فتح الباری لابن حجر ۱۳/۹' وفتح الباری لابن رجب ۱۰۲/۱۔

(۲) سنن ابن ماجه' كتاب النكاح' باب ما جاء في فضل النكاح۔

(۳) صحيح البخاري' كتاب الجمعة' باب ما يكره من ترك قيام الليل لمن كان يقومه وصحيح مسلم' كتاب الصيام' باب النهي عن صوم الدهر۔

روزے رکھتے ہیں؟ رات کو کتنی عبادت کرتے ہیں؟ اب جو خبر دی گئی تو انہوں نے اسے اپنے اندازے سے کم پایا۔ خیر دل کو تسلی دی کہ حضور ﷺ تو معصوم ہیں' آپؐ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی اور اگر بالفرضِ محال کوئی غلطی ہو بھی گئی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرما چکا ہے: ﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح:۲) ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے طے کیا کہ میں ساری رات قیام کیا کروں گا اور کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا میں تو ہر روز روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں کبھی شادی نہیں کروں گا' تجرد کی زندگی بسر کروں گا' شادی بیاہ کا کھکھیڑ مول نہیں لوں گا۔ حضور ﷺ تشریف لائے تو آپؐ کو اس کی خبر دی گئی۔ آپ ﷺ نے ان تینوں حضرات کو بلا کر دریافت فرمایا: کیا تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کیں ہیں؟ اس کے بعد حضور ﷺ کی زبان مبارک سے غیر معمولی الفاظ ادا ہوئے: ''خدا کی قسم' میں تم سب سے بڑھ کر متقی ہوں' سب سے بڑھ کر اللہ کی خشیت رکھنے والا ہوں' لیکن میرا طریقہ یہ ہے کہ میں رات کو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں' میں روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پھر فرمایا: ((مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ))(۱) کان کھول کر سن لو ''جس کو میری سنت پسند نہیں ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ دراصل یہ طریقہ تو بدھ مت کے بھکشوؤں' جین مت کے سادھوؤں اور عیسائی راہبوں کا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے بطور ادارہ (institution) اس راستے کو بند کر دیا ہے۔

دوسرا راستہ کیا ہے؟ اس تعبیر پر توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ ہے فرائض کا التزام اور نوافل میں اعتدال۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے یہ دونوں کام ضروری ہیں۔ اسلام میں اس مجاہدے کی کیفیت' بھوک اور محنت برداشت کرنے' مشقتیں جھیلنے' لذائذِ دنیا سے کنارہ کشی کرنے اور مصائب برداشت کرنے کو جدوجہد اور کوشش یعنی جہاد فی سبیل اللہ کی طرف منتقل کیا گیا ہے' تاکہ اس پوری قوت اور پوری توانائی (energy) کو کام میں لایا جائے۔ اسے معاشرے کی اصلاح' استحصال (exploitation) کے خاتمے' ظلم کے استیصال' عدل کے قیام' حق کا بول بالا کرنے اور نظامِ عدل و قسط کے قائم کرنے میں استعمال کیا جائے' تاکہ بہت سارے انسانوں کو اس بات کا موقع ملے کہ وہ اپنے ربّ سے لو لگا سکیں۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب النکاح' باب ما جاء فی فضل النکاح۔

فرمایا ہے کہ جس معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہو جاتا ہے وہاں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں دولت کا ارتکاز ہو گا' وہاں عیاشیاں ہوں گی' وہاں گلچھرے اڑائے جائیں گے اور جہاں فقر و احتیاج ہو گا وہاں انسان حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اعلیٰ خیالات' اللہ کی طرف توجہ و انابت اور اللہ کے ساتھ لو لگانے کا تصور' اس کے حاشیۂ خیال ہی سے باہر نکل جائیں گے اور انسان حیوان بن کر رہ جائے گا' لدّو اونٹ یا کولہو کا بیل بن کر رہ جائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا))(۱) ''قریب ہے کہ فقر کفر تک لے جائے''۔ عہد حاضر کے شاعر نے اس کی خوب ترجمانی کی ہے ؎

دنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے!

بہرکیف قرآن مجید اس قوت کو جو مجاہدہ مع النفس سے حاصل ہوتی ہے' ظلم کے استیصال کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ قرآن کا فلسفہ جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ عبادات جو فرض ہیں ان کا التزام اور نوافل کے اندر اعتدال ـــــ اور اس توازن کے ساتھ اصل قوت جو اس سے پیدا (generate) ہوتی ہے اس کا رُخ ظلم کے استیصال کے لیے موڑ دیا جائے۔ لیکن لفظ ظلم کو سمجھ لیں کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمٰن) ''بے شک شرک ظلمِ عظیم ہے''۔ اور پھر دوسرا ظلم ہے جو معاشرے میں تین سطحوں پر ہو رہا ہے۔ یعنی سماجی سطح پر یہ اعلیٰ ہے' یہ ادنیٰ ہے' یہ گھٹیا ہے' یہ بڑھیا ہے' کوئی بے چارا پیدائشی نیچ پیدا ہوا ہے اور کوئی اونچ پیدا ہوا ہے۔ یہ تفریق (discrimination) ظلم ہے۔ پھر معاشی سطح پر کچھ لوگ استحصال کرنے والے (exploiters) ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جو استحصال زدہ (exploited) ہیں۔ کہیں دولت کے انبار لگ رہے ہیں اور دولت مندوں کے کتوں کے لیے جو کچھ ہے وہ غریب کی اولاد کے لیے نہیں ہے۔ اسی طرح سیاسی سطح پر جبر ہے' حاکم اور محکوم کی تقسیم ہو گئی۔ کچھ حکومت کر رہے ہیں اور کچھ محکوم بن کر رہ گئے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ع ''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے''۔ بندہ و آقا کی یہ تقسیم درحقیقت بہت بڑا ظلم ہے۔

جان لیجیے' ظلم چاہے اللہ کے ساتھ ہو رہا ہو بشکل شرک' یا ظلم سیاسی سطح پر' سماجی سطح پر

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان۔ بحواله مشكاة المصابيح' كتاب الآداب' ۔وضعيف الجامع الصغير وزيادته للالبانی' ح:٤١٤٨۔

معاشی سطح پر ہو رہا ہو' قرآن چاہتا ہے کہ اہل ایمان میں وہ روحانی قوت پیدا ہو جو اس کی اصلاح کر سکے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو قائم رہو انصاف پر' گواہی دو اللہ کے لیے۔''

اور

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدۃ:۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کھڑے ہو جاؤ اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے کے لیے۔''

اسی طرح سورۃ الحدید میں ارسالِ رُسل اور ان کے ساتھ انزالِ کتاب و میزان کا مقصد یہ بیان فرمایا گیا: ﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۲۵) ''تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں''۔ ہاں! اگر نظامِ عدل و قسط قائم ہو گیا ہے تو اب موقع ہے' اب آپ تقرب بالنوافل کے اندر جتنی کثرت چاہے کر لیں۔ اس لیے کہ عدل کا ماحول قائم ہو چکا ہے' حق دار کو حق مل رہا ہے' ہمارے ہاں بھی جن حضرات کا ابتداءً اس بات کی طرف رجحان ہوا' وہ اسی لیے تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ سیاسی نظام میں جو بگاڑ آ گیا ہے اس کی اصلاح اب ناممکن ہے۔ بار بار کوشش کی گئی' حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام' پھر حضرت نفسِ زکیہؒ کی کوشش' اس طرح کی مختلف کوششیں کی گئیں' لیکن پھر تو اس کے ساتھ ایک طرح سے مصالحت و مفاہمت کر لی گئی اور توجہ کو دوسرے کاموں کی طرف مرتکز کیا گیا۔ اس طرح سے ہمارے ہاں خانقاہی نظام وجود میں آیا۔ لیکن اس میں اصلاح ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ نے ایک عظیم الشان تحریک اٹھائی جو ''تحریکِ شہیدین'' کے نام سے معروف ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ سید صاحبؒ سلوک کے تمام سلاسل یعنی نقشبندیہ' سہروردیہ' چشتیہ اور قادریہ میں بیعت کرنے کے بعد اپنے مسترشدین سے ''سلسلہ محمدیہ ﷺ'' میں بیعت لیتے تھے۔ سلسلہ محمدیہ جہاد و قتال والا سلسلہ ہے۔ اس میں اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے دوران فقر بھی آئے گا' فاقہ بھی آئے گا' تکلیفیں بھی آئیں گی' یہاں روزے کی سی کیفیات بھی آئیں گی' یہاں نفس کے مرغوبات سے محروم ہونا پڑے گا' اور جو نفس کے لیے ناگوار چیزیں ہے' انہیں جھیلنا پڑے گا۔

یہ مجاہدہ مع النفس کا اصل طریقہ ہے۔ ابتدا کی حد تک اس میں وہی عبادات' صلوٰۃ و صوم و زکوٰۃ کا اہتمام ہے' لیکن اس کے بعد اس کے رخ کو تبدیل کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہی

سلوکِ محمدی کی امتیازی شان ہے۔ ہمیں رجوع کرنا چاہیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف۔ ہم ان کو اپنا آئیڈیل سمجھیں گے' وہ سلوکِ محمدی ﷺ کا اصل مرقع تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی تربیت وتزکیہ کا اصل product اور نتیجہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیات ہیں۔

تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل حدیث کی روشنی میں

بخاری ومسلم کی متفق علیہ روایت میں یہ نسبت وتناسب بڑی عمدگی سے بیان ہوا ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ' وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ ' وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ ' فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ' وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ' وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا' وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا' وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ' وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ)) (۱)

'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: جس کسی نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی تو اُس کے خلاف میری جانب سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور جن اعمال سے میرا بندہ میرا قرب اختیار کرتا ہے اُن میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ اعمال ہیں جو میں نے اُس پر فرض ٹھہرائے ہیں۔ اور بندہ نوافل کے ذریعے سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو ضرور اُسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرتا ہے تو ضرور پناہ دیتا ہوں۔''

یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ التزامِ فرائض ضروری ہے' اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ فرائض میں عبادات یعنی نماز روزہ' زکوٰۃ اور حج بھی ہیں' فریضۂ اقامتِ دین بھی ہے اور فریضۂ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب التواضع۔

دعوت وتبلیغ بھی ہے۔ اجتماعی فرائض میں اپنی امکانی حد تک ہر شخص مکلف ہے کہ اس میں حصہ لے۔ اس کے بعد تقرب بالنوافل کا مقام ہے۔ اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرب کا مقدم درجہ تقرب بالفرائض ہے اور محبوب تر تقرب بالنوافل ہے۔ اگر عدل وانصاف کا ماحول قائم ہو چکا ہو' دین کا بول بالا ہو چکا ہو' ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (الاسراء) ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا' بے شک باطل تو ہے ہی مٹ جانے کے لیے'' کی شان ظاہر ہو چکی ہو تو پھر تو پوری قوت کا ارتکاز تقرب بالنوافل ہی پر ہوگا۔ اس طرح کا قرب احادیثِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے' ان الفاظ کے اندر کوئی ابہام نہیں۔ اس حدیث کی شرح میں ابن عربیؒ جو بعض حضرات کے نزدیک بہت ہی مبغوض ہیں' نے بہت ہی عجیب بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تقرب بالنوافل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ انسان کا ہاتھ بن جائے' اللہ انسان کا کان بن جائے' اللہ انسان کی آنکھ بن جائے۔ لیکن تقرب بالفرائض کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے' کیونکہ اب وہ انسان دین حق کا بول بالا کرنے میں لگا ہوا ہے' یہ اللہ کا مددگار بن گیا ہے' اُس کا ناصر بن گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی شان یہ ہے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ﴾ (آل عمران:۱۸) ''اللہ نے گواہی دی ہے کہ کوئی معبود نہیں اُس کے سوا' اور فرشتوں نے' اور علم والوں نے بھی' وہی عدل کا قائم کرنے والا ہے''۔ تو جو بھی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے' محنت و کوشش کر رہا ہے' گویا وہ اللہ کا ہاتھ بن گیا ہے' اس کا دست و بازو بن گیا ہے۔ وہ اُس کام میں لگا ہوا ہے جو اللہ کو پسند اور محبوب ہے۔ اس کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے فرمائی ہے ع ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!'' یعنی دین حق کی اقامت واشاعت کی جدوجہد کرنے والا ایک گروہ جو ''حزب اللہ'' کی شکل اختیار کر لے' یہ لوگ اللہ کے محبوب اور پسندیدہ بندے ہیں۔ اقبال ہی نے ایسے افراد کے بارے میں کہا ہے ع ''صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم!'' سورۃ الانبیاء کے الفاظ یاد آ رہے ہیں' فرمایا: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ﴾ (الانبیاء:۱۸) ''ہم ضرب لگاتے ہیں باطل پر حق کے ساتھ''۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

یہ قوت بننا درحقیقت سلوکِ اسلامی اور سلوکِ روحانی کی معراج ہے۔ اگر کتاب وسنت اور

سیرتِ صحابہؓ سے سلوک کی منازل کو سمجھا جائے تو یہی ہے جو کچھ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ تقرب الی اللہ کے لیے دو کام کرنے ہوں گے۔ ایمان میں گہرائی‘ پختگی اور یقین پیدا کرنا ہوگا‘ معرفتِ ربّ پیدا کرنا ہوگی۔ پھر فرائض کے ذریعے اللہ کے قرب کا راستہ طے کریں‘ اُس وقت تک جب تک کہ حق کا بول بالا نہیں ہو جاتا‘ ظلم کا استیصال نہیں ہو جاتا۔ اگر وہ وقت آ جائے تو تقرب بالنوافل کا راستہ کھلا ہوگا۔

آخری بات یہ کہ اس سلوک میں قوتِ ارادی درکار ہے۔ جس شخص کے اندر یہ عزم اور ارادہ پیدا ہو جائے‘ اگر وہ خود قوی الارادہ ہے تو ’’قرآن وسنت‘‘ اور ’’سیرت النبی وسیرتِ صحابہؓ‘‘ ایسی دو آنکھیں ہیں جن سے وہ راستے خود طے کر لے گا۔ لیکن اگر قوتِ ارادی کمزور ہو جیسے کہ اکثر لوگوں کی ہوتی ہے‘ تو کسی قوی الہمت‘ صاحبِ عزیمت شخص کی صحبت اور اس کا قرب درکار ہے‘ اس کے نزدیک رہ کر اس کی مصاحبت کے ذریعے انسان راستہ طے کر سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبۃ) ’’سچوں کے ساتھ جُڑ جاؤ‘‘۔ دراصل یہ ہے وہ سلسلۂ ارشاد جو چلا آ رہا ہے کہ کسی قوی الہمّت‘ قوی العزم شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے جس پر دل ٹھک جائے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے‘ بہروپیا نہیں ہے‘ یہ واقفِ راہ ہے‘ راستے کے نشیب وفراز کو جانتا ہے‘ جانتا ہے کہاں کہاں غلط موڑ آتے ہیں‘ ایسے شخص کے ساتھ رشتہ استوار کیا جائے۔ اسی کا نام پیری مریدی ہے۔ مرید کہتے ہیں ارادہ کرنے والے کو۔ اگر اللہ تعالیٰ اِسے کسی ایسے شخص تک پہنچا دے جس پر انشراح ہو جائے‘ دل گواہی دے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے‘ اس کے اندر خلوص واخلاص ہے‘ یہ مجھے واقعتاً صحیح راہ پر چلائے گا‘ واقفِ راہ ہے‘ دین کا جاننے والا ہے‘ پھر یہ کہ اس دور کے تقاضوں کو بھی جانتا ہے‘ اس دور کی مشکلات سے بھی واقف ہے تو ایسے شخص کے ساتھ تعلق قائم کر لینا یقیناً بہت مفید اور بہت مُمِدّ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے عام مشاہدے کے مطابق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی طرح صحبت اور معیّت سے بھی شخصیت پر اثر پڑتا ہے‘ اگرچہ اس کی شرائط کڑی ہیں۔ محض رسماً تعلق قائم کرنا یا خانہ پُری کرنا میرے نزدیک کسی درجے میں مفید نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی سچی معرفت اور تعلق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

سُنّتِ نبویؐ — فضیلت واہمیّت

عتیق الرحمٰن صدیقی

حدیث کا لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے حدیث کے معنی بات' خبر' اطلاع' بیان' ذکر اور روایت کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں حدیث سے مراد وہ جملہ ہے جس کی نسبت حضور نبی کریم ﷺ یا حضرتِ اقدس کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف ہو۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعے پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا﴾ (التحریم:۳) ''اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی''۔ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ﴾ (الغاشیة) ''بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت کا) حال معلوم ہوا ہے''۔ اور آیت کریمہ ﴿وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ﴾ (یوسف:۱۰۱) ''اور تُو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا'' میں احادیث سے مراد رؤیا ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھی حدیث کہہ کر پکارا ہے' چنانچہ فرمایا: ﴿فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖ﴾ (الطور:۳۴) ''تو ایسا کلام بنا لائیں''۔ ﴿اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ﴾ (النجم) ''(اے منکرین خدا) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو؟'' ﴿فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا﴾ (النساء) ''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟'' ﴿حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ﴾ (الانعام:۶۸) ''یہاں تک کہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں''۔ ﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ﴾ (الجاثیة) ''تو یہ اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟'' ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا﴾ (النساء) ''اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے؟''

(مفردات القرآن)

اقسام

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے احادیث کی اقسام کو ذیل کے الفاظ میں واضح کیا ہے:

''(۱) وہ تمام کلمات' اقوال اور ارشادات جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ فیض ترجمان سے وقتاً فوقتاً صادر ہوئے۔ (۲) وہ ہدایات جو آنحضرت ﷺ نے مختلف اوقات میں لوگوں کو دیں یا وہ نصائح جو آپؐ نے کیں۔ (۳) آنحضور ﷺ کی پرائیویٹ اور خانگی زندگی کی وہ تمام باتیں' وہ تمام واقعات' وہ تمام حالات اور وہ تمام معمولات جو ازواجِ مطہرات سے دریافت کر کے بیان کیے گئے۔ (۴) وہ تمام باتیں جو حضرت اقدس ﷺ کے سامنے صحابہؓ نے کیں اور وہ تمام افعال جو حضور ﷺ کی موجودگی میں صحابہؓ سے سرزد ہوئے' آپؐ نے یا تو انہیں پسند فرمایا' یا ناپسند فرمایا یا ان کے متعلق خاموشی اختیار کی۔ (۵) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام ایسے اقوال جن میں انہوں نے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے فلاں موقع پر فلاں معاملہ کے متعلق ایسا ایسا حکم دیا تھا یا فلاں کام سے روکا تھا یا فلاں کام کرنے کو کہا تھا' مگر صحابی نے آنحضور ﷺ کے اصل الفاظ تو نہیں بتلائے بلکہ حضورؐ کے ارشاد کا صرف مفہوم بیان کیا۔ (۶) کسی صحابی نے حضور ﷺ کے زمانہ کا کوئی واقعہ بیان کیا یا قرآن کریم کی کسی آیت یا سورۃ کی تشریح اور تفسیر بیان کی۔ (۷) حضور ﷺ کی سیرت و خصلت' حضور ﷺ کے اخلاق و عادات' حضور ﷺ کے معمولات' حضور ﷺ کا حلیہ' لوگوں کے مختلف طبقات سے حضور ﷺ کے تعلقات' حضور ﷺ کی خانگی اور بیرونی زندگی کے واقعات' حضور ﷺ کے غزوات' عزیزوں' دشمنوں اور مخالفوں' بت پرستوں' مجوسیوں' عیسائیوں اور یہودیوں سے حضور ﷺ کا برتاؤ' غرضیکہ آنحضرت ﷺ کی ہر وہ بات جو محدثین کو مل سکی انہوں نے بطور حدیث بیان کی۔'' (سیرت الرسولؐ)

حدیث اور سُنّت

مختصراً حدیث سے مراد وہ خبر ہے جو حضور ﷺ سے منسوب کی گئی ہو' جو حضور ﷺ کے قول فعل یا تقریر پر مبنی ہو۔ نوعیت کے اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ہیں: حدیثِ قولی' حدیثِ فعلی اور حدیثِ تقریری۔ قولی سے مراد وہ حدیث ہے جو حضور ﷺ کے قول پر مبنی ہو اور فعلی وہ ہے جس کا مدار نبی کریم ﷺ کے عمل پر ہو۔ حدیث تقریری ایسی حدیث کو کہتے ہیں جو حضور ﷺ کا قول یا عمل نہ ہو بلکہ صحابہ کا قول یا عمل ہو جو آپؐ کی موجودگی میں ہوا اور آپؐ نے خاموشی اختیار

فرمائی۔ سنت راستے' طریقے اور قاعدہ کو کہا جاتا ہے۔ عموماً سنت اور حدیث کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں' لیکن بعض علماء سنت سے مراد حضور ﷺ کے ثابت شدہ اقوال' افعال اور تقریر جبکہ حدیث سے مراد حضور ﷺ سے منسوب اقوال' افعال اور تقریر لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک حدیث عام ہے اور سنت خاص۔ محمد راغب الطباخ نے ''صاحبِ موافقات'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

''لفظ سنت کا اطلاق اس بات پر ہوتا ہے جو نبی ﷺ سے منقول ہو' خصوصاً وہ امور جن کی بابت قرآن میں کوئی منصوص حکم موجود نہ ہو بلکہ وہ صرف نبی ﷺ سے منصوص ہوں' خواہ وہ ہمیں کتاب (قرآن) کی کسی منصوص آیت کا بیان نظر آئے یا نظر نہ آئے۔ نیز سنت کا لفظ بدعت کے مقابلہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ — فلاں سنت پر ہے — جبکہ اس کا عمل نبی ﷺ کے عمل کے مطابق ہو خواہ اس (عمل) کا ذکر صراحتاً کتاب میں موجود ہو یا نہ ہو اور اس کے مقابل یوں کہا جاتا ہے کہ — فلاں بدعت پر گامزن ہے — جبکہ وہ سنت کے خلاف عمل کرے۔ لفظ سنت کے اس اطلاق میں صاحبِ شریعت کے عمل کا اعتبار کیا گیا ہے' یعنی عملِ رسول کی جہت سے اس کو سنت کہتے ہیں اگرچہ وہ عمل کتاب (قرآن) کے مقتضا کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ نیز لفظ سنت کا اطلاق صحابہ کے عمل پر بھی کیا جاتا ہے خواہ وہ عمل کتاب یا سنت میں صراحتاً مذکور ہو یا نہ ہو' کیونکہ یہ امر طے شدہ ہے کہ انہوں نے یقیناً اس سنت کی اتباع کی جو ان کے نزدیک ثابت شدہ تھی۔''

(تاریخ افکار علوم اسلامی' ترجمہ افتخار احمد بلخی)

شریعت کے دو بنیادی ماخذ

یہ حقیقت ہر لحظہ پیش نظر رہے کہ اسلامی شریعت کے مصادر و ماخذ دو ہیں' اوّلین ماخذ کتاب اللہ ہے اور دوسرا حدیث رسول ﷺ جو سنتِ نبویہ کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب اللہ کی تفہیم کا انحصار اس پر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی جو تفسیر و تشریح فرمائی ہے اسے اپنے اعمال کی بنیاد بنایا جائے۔ کتاب حکیم میں بہت سی آیات مجمل ہیں' مثلاً نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج وغیرہ' تو ظاہر ہے کہ ان احکام پر عمل ممکن نہیں جب تک کہ ان کی تفصیلات سامنے نہ آئیں۔ نماز کی ہیئت' اس کی رکعات کی تعداد اور اس کے اوقات وغیرہ کا علم لازمی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے نصاب وغیرہ کی معرفت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو قرآن مجید کی تفصیلات بیان کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے' بالفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا

﴿نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤) ''اور ہم نے (اے محمد ﷺ) تم پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے اس کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے نازل کی گئی ہے''۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ))(۱)

''آگاہ رہو مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے مثل اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی۔ ہاں مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے مثل ایک اور چیز بھی''۔

اللہ کا عظیم احسان

اللہ تعالیٰ نے ہمیں زندگی گزارنے کے لیے جو صاف ستھرا' پاکیزہ اور منزہ طریقِ حیات عطا فرمایا ہے وہ دین اسلام ہے ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾۔ یہ وہ صراطِ مستقیم ہے جو ہماری کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کا ضامن ہے' ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ.....﴾ کے مصداق کامل اور مکمل دین ہے۔ اس نعمتِ عظمیٰ کا اتمام کر کے اللہ نے اپنے بندوں پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ان کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا بلکہ ایک ایسا رسول مبعوث فرمایا جو اپنے جلو میں نورِ مبین لے کر آیا' جو کتابِ مبین کی آیات انہیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے' اس کے نکات کی گرہیں کھولتا ہے' اس کے اسرار و رموز کو واشگاف کرتا ہے' اس کی حکمتوں سے انہیں شناسا کرتا ہے اور پھر ان کی تربیت اور ان کا تزکیہ و تصفیہ کرتا ہے۔ قرآن نے کہا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا: ٢٨) ''اے نبی ہم نے آپ کو تمام نسل انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر سلسلۂ نبوت کی تکمیل کر دی اور فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب: ٤٠) ''مگر (محمد ﷺ) اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں''۔ اللہ نے آپ کی حیاتِ طیبہ کو مومنوں کے لیے ہمیشہ کے لیے ایک نمونہ ٹھہرایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ٢١) ''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی زندگی میں پیروی کی عمدہ مثال ہے''۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی عبادت و ریاضت' ان کی بود و باش' رہن سہن' عادات و خصائل' نشست و برخاست غرضیکہ آپ کی پوری زندگی مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے ایک نمونہ ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب فی لزوم السنة۔ ومسند احمد' ح: ١٦٥٤٦۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَخَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ))(۱)

''یقیناً بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے۔''

حضور نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

((تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا: کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ نَبِیِّہٖ))(۲)

''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھام لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے۔''

معلوم ہوا کہ قرآن وسنت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی منبع سے نکلنے والی دو نہریں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن وحی جلی ہے اور حدیث وحی خفی۔ یعنی وحی کی دو قسمیں ہیں' ایک تو وہ جو جبریل امین اللہ تعالیٰ کا کلام آپؐ کے قلب اطہر پر نازل کرتے وہ وحی متلو ہے اور دوسرے وہ باتیں جو آپؐ صحابہ کرام کو تشریح و وضاحت میں اللہ کے حکم سے بیان کرتے وہ وحی غیر متلو ہے۔ قرآن وحدیث کا دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور مفہوم دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں جبکہ احادیث کا مفہوم من جانب اللہ ہے لیکن الفاظ حضور ﷺ کے ہیں۔

رسول کی اطاعت' اللہ کی اطاعت ہے

قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ فرمایا:

﴿وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷)

''جو کچھ رسول تمہیں دیں وہ لے لو اور جس بات سے وہ تمہیں منع کریں اس سے رک جاؤ۔''

اور دوسری جگہ بڑی زوردار صراحت کے ساتھ فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔''

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔ ومسند احمد' ح:۱۳۴۵۵۔

(۲) موطا امام مالک' کتاب الجامع' باب النھی عن القول بالقدر۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین وشریعت کو سمجھنے کے لیے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنا ہوگا' اس لیے کہ وہی ہمارے ہادی ورہنما ہیں ۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

یعنی اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچاؤ' اس لیے کہ وہ سراپا دین ہیں۔ اگر تم ان تک نہ پہنچے یعنی ان سے دین حاصل نہ کر سکے تو تمہاری زندگی سراپا شر ہے جس طرح ابولہب کی زندگی تھی۔

اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو حکم کرتا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں واقعی اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱﴾ (آل عمران)

''اے نبیؐ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا' وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی اطاعت اور اتباع کی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى)) قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّاْبٰى؟ قَالَ :((مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى)) (۱)

''میری اُمت کا ہر شخص جنت میں جائے گا سوائے اُس کے جس نے (خود ہی جنت میں جانے سے) انکار کیا۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! انکار کرنے والا کون ہوگا؟ ارشاد ہوا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا' اور جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے درحقیقت انکار کیا۔''

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما ' آئینِ ما

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ۔

مسلمان کی پہچان

دنیا میں رسالت ہی سے ہماری مسلمانی کی پہچان ہے اور رسالت ہی سے ہمارا دین اور آئین قائم و دائم ہے —— اور جب تک ہم رسول کریم ﷺ کے فیصلوں پر راضی نہ ہو جائیں ہمارا ایمان مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء)

''(اے محمد ﷺ!) آپ کے رب کی قسم' یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ باہمی اختلافات میں یہ آپؐ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔''

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو!

''مسلمانو! اگر تم اس دنیا میں اپنا مقام چاہتے ہو تو اپنا دل اللہ سے لگاؤ اور نبی کریم ﷺ کا راستہ اختیار کرو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول یہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہر بات اور نصیحت کو حرزِ جان بناتے تھے اور پھر آگے پہنچانے کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ان کے پیش نظر تھا:

((نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ [فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا] فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرَ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو شاد و شاداب رکھے جو میری بات سنے پھر اسے یاد کرے اور محفوظ رکھے اور دوسروں تک اسے پہنچائے' پس بہت سے لوگ فقہ (یعنی علم دین) کے حامل ہوتے ہیں مگر خود فقیہ نہیں ہوتے اور بہت سے علم دین کے حامل اس کو ایسے بندوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہوں۔''

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱) سنن ابن ماجه' المقدمة' باب من بلغ علما۔ عن زيد بن ثابت رضی اللہ عنہ۔

((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (۱)

''تم میں سے جو موجود ہے وہ اس شخص تک بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہے۔''

اسلامی انقلاب اور اُسوۂ حسنہ

حضور نبی کریم ﷺ کے جُہدِ مسلسل کی بدولت قرن اوّل میں جو محیّر العقول انقلاب برپا ہوا اور فکر و عمل کے اعتبار سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آیا' یہ ہمہ جہت اور ہمہ پہلو تبدیلی آپؐ کے اُسوۂ حسنہ' آپؐ کی مناسب و موزوں حکمت عملی' ارشادات و ہدایات' مواعظ و نصائح' طریق عمل میں توازن' عدل و انصاف کی کارفرمائی اور محروم و پس ماندہ طبقات کے حقوق کے تحفظ کی بدولت رونما ہوئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں عقائد و اعمال کے ساتھ اسلامی اخلاق' گہرے دینی جذبات' دل ربا کیفیات' اعلیٰ و ارفع اذواق کی جلوہ نمائی صرف تلاوتِ کتاب کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ بھی مؤثر اور نمایاں اسباب تھے۔ مؤثر ترین زندگی اور حسنِ سیرت سے آراستہ پیراستہ نمونے جذب و کشش کا سامان مہیا کرتے تھے۔ کتاب اللہ سے لگن' وابستگی اور عشق نے ان میں ایسے اوصافِ جمیلہ کو نشو و نما دی کہ وہ انسانیت کی معراج پر ضوفشاں دکھائی دیے۔ یہ دراصل سنت نبویہ کی کرشمہ سازی تھی۔ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کے احکامات و فرامین جن کے مجموعے کا نام حدیث و سنت ہے' دین کے لیے روح پرور اور دلکشا ماحول پیدا کرنے اور پُرکشش فضا استوار کرنے میں ایسا اثر انگیز کردار ادا کرتے ہیں جس میں دین کا پودا سرسبز اور بارآور ہوتا ہے۔

اخذ و استفادہ

(۱) مفردات القرآن' امام راغب اصفہانی۔ (۲) سیرت الرسول ﷺ' ڈاکٹر محمد حسین ہیکل
(۳) تاریخ افکار و علوم اسلامی' محمد راغب الطباخ (۴) معارف الحدیث' مولانا محمد منظور نعمانی
(۵) راہِ عمل' جلیل احسن ندوی (۶) الحکمہ' شیخ عمر فاروق
(۷) حدیث کی اہمیت اور ضرورت' خلیل الرحمٰن چشتی
(۸) خطباتِ بہاولپور' ڈاکٹر محمد حمید اللہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبة ایام منی۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات' باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

حالاتِ زندگی اور خدماتِ دینی

انجینئر نوید احمد

قرآن اکیڈمی ڈیفنس کراچی میں اتوار ۱۸/اپریل کو اکیڈمک ڈائریکٹر انجینئر نوید احمد صاحب نے محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے حالاتِ زندگی اور خدماتِ دینی کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ انہوں نے اس خطاب کو تحریری طور پر مرتب کر کے میثاق میں اشاعت کے لیے ارسال کیا ہے' جو نذرِ قارئین ہے۔

سورۃ النحل (آیت ۹۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾

''جس نے اچھا عمل کیا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ عمل ایمان و اخلاص کے ساتھ ہو تو ہم اُسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اُس کی نیکیوں کا عمدہ اجر عطا فرمائیں گے۔''

ڈاکٹر اسرار احمدؒ بلاشبہ اِس آیت میں دی جانے والی بشارت کے مصداق تھے اور وہ ایک پاکیزہ زندگی گزار کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ امید ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں ایک مطمئن نفس کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ ایسا نفس جو مطمئن ہوگا کہ میں نے دنیا کی عارضی زندگی کے اوقات اُس کام میں لگائے جن میں یہ اوقات لگنے چاہئیں تھے۔ گویا ڈاکٹر صاحب اُن نفوس میں شامل ہوں گے جو ﴿لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴾ (الغاشیۃ) یعنی اپنی محنتوں پر شاداں و فرحاں ہوں گے۔ آیئے ڈاکٹر صاحب کے حالاتِ زندگی اور اُن کی خدماتِ دینی کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی حیاتِ باسعادت کو چھ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور

ولادت تا شعوری زندگی

۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۷ء

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے آباء واجداد کا تعلق یوپی سے تھا اور وہ وہیں آباد تھے۔ ۱۸۵۷ء میں تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے آپ کے دادا کو انگریز سرکار کی طرف سے عتاب کا اندیشہ تھا' لہٰذا وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے مشرقی پنجاب آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی ولادت ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ حصار میں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب بچپن ہی سے انتہائی حساس مزاج کے حامل تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب اُنہیں علامہ اقبال کے وصال کی خبر ملی تو اُنہوں نے اِسے ایک ذاتی صدمے اور قومی نقصان کے طور پر محسوس کیا۔ علامہ اقبال سے دلی لگاؤ کا عالم یہ تھا کہ محض ۱۰ برس کی عمر میں اُن کی اردو شاعری کے پہلے مجموعہ 'بانگِ درا' کا مطالعہ مکمل کر لیا۔ اقبال کے اُن اشعار نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا جن میں اُمت کے پھر سے عروج کے لیے اُمید افزا پیغام ہے' مثلاً: ؂

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
نوا پیرا ہوا ے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

سبق پھر پڑھ صداقت کا' شجاعت کا' عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی اِمامت کا

البتہ جوابِ شکوہ کے ایک شعر نے ڈاکٹر صاحب کو ہلا کر رکھ دیا: ؂

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اِس شعر سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہو گئی کہ اُمت کے زوال کا اصل سبب قرآن سے دُوری ہے اور گویا اوائل عمر ہی سے خدمتِ قرآن کا جذبہ آپ کی سوچ میں سرایت کر گیا۔ اِس کے بعد اسلام کو پھر سے غالب کرنے کا ولولہ آپ کے اندر بڑی شدت سے موجزن ہو گیا جب آپ

نے ۱۳ برس کی عمر میں حفیظ جالندھری کا 'شاہنامہ اسلام' پڑھا جس کا عنوان یہ شعر ہے کہ: ؎

کیا فردوسیٔ مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں اسلام کو زندہ

۴۷۔۱۹۴۶ء میں جب ڈاکٹر صاحب شعور کی عمر میں داخل ہو رہے تھے تو اُس وقت برصغیر میں مسلمانوں کے بہی خواہ نظریاتی اعتبار سے تین دائروں میں تقسیم تھے۔ایک سوچ جمعیت علمائے ہند کی تھی کہ ہماری اوّلین ترجیح ہندوستان کو انگریزی استعمار سے آزاد کرانا ہے' اِس کے لیے ہمیں ہندوؤں سے اتحاد کر لینا چاہیے۔اگلے مرحلہ میں ہم شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں گے۔ہندو اگر اس جدوجہد کے مخالف ہوئے تو ہم اُن کا مقابلہ کر لیں گے کیونکہ ہم نے اُن پر کئی سو سال حکومت کی ہے۔مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے بعد ہم ہندو قوم کے ظلم وستم کا شکار ہو جائیں گے' کیونکہ ہمیں بار بار اُن کی مسلم دشمنی اور تعصّب کا تجربہ ہو چکا ہے۔ہمیں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کرنا چاہیے۔اِس ریاست میں ہم اسلام کی عادلانہ تعلیمات کے نفاذ سے لوگوں کو اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا نمونہ دکھا دیں گے۔جماعتِ اسلامی کا نظریہ یہ تھا کہ ہمارا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں بلکہ اسلام کی سربلندی ہونا چاہیے۔نسلی مسلمانوں اور نسلی غیر مسلموں کے سامنے دینِ اسلام کی دعوت اور اِس کے عملی تقاضے رکھے جائیں۔جو لوگ شعوری طور پر اِس دعوت کو قبول کر لیں اسلام کی سربلندی کے لیے اُن ہی کی جدّوجہد نتیجہ خیز ہوگی۔اسلام غالب ہو گیا تو نہ صرف دنیا میں حقوق وبرکات ملیں گی بلکہ آخرت کی تیاری کے لیے بھی سازگار فضا میسّر آئے گی۔

ڈاکٹر صاحب نے جمعیت علماء ہند میں شامل علماء کرام کے تقویٰ اور خلوص کا اعتراف کرنے کے باوجود اُن کی سوچ سے اتفاق نہیں کیا۔انگریزوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے اب ہندو زندگی کے ہر شعبے میں بہت ترقی کر چکے تھے اور اُن کے اندر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کی آگ بھڑک رہی تھی۔علماء کو اِس کا اندازہ نہیں تھا' لیکن عوام مسلسل مختلف معاملات میں ہندو تعصب کا سامنا کر رہے تھے۔اِسی لیے اُنہوں نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی اور اُس کے حق میں بھاری اکثریت سے رائے دی۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں مسلم لیگ کا موقف اور جماعت اسلامی کا نظریہ درست تھا

اور یہ درحقیقت ایک ہی مقصد کے دو مراحل تھے۔ پہلے مسلم لیگ کے لائحۂ عمل کے مطابق مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کے حصول کی کوشش کی جائے اور پھر جماعت اسلامی کے طریقۂ کار کے مطابق وہاں اسلام کے غلبہ کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اِسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور ایک فعّال کردار ادا کیا۔ وہ ضلع حصار میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اِسی حیثیت میں وہ اُس وفد میں شامل تھے جو حصار سے لاہور قائداعظم سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جماعت اسلامی کے دعوتی لٹریچر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کتب و رسائل کا مطالعہ کیا۔ پھر جب ہندوستان کی تقسیم کے وقت فسادات شروع ہوئے تو حفاظتی کیمپوں میں جماعت اسلامی کے رسالہ ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونے والے 'تفہیم القرآن' کے حواشی کا مطالعہ کیا۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے۔ ہجرت کے دوران ۲۰ دن میں ۷۰ میل کا پیدل سفر کیا۔

دوسرا دور

فکرِ مودودیؒ کے ساتھ وابستگی

۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء

پاکستان آمد کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ اُس وقت آپ جماعت اسلامی کے حلقہ ہمدردان میں شامل ہوگئے۔ اب آپ نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مزید یہ کہ جماعت اسلامی کی نفاذِ دستورِ اسلامی میں بھرپور حصہ لیا۔ اِس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد دستورِ پاکستان میں شامل کردی گئی۔ اِس کے ذریعہ اصولی اعتبار سے طے کیا گیا کہ پاکستان میں کوئی قانون سازی قرآن وسنت کے منافی نہ ہوگی۔

۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر صاحب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہوگئے۔ باقاعدہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت اختیار کرلی۔ جمعیت کے پلیٹ فارم نے آپ کی تحریری، تقریری اور تدریسی صلاحیتوں کو خوب نکھرنے کا موقع فراہم کیا۔ جمعیت میں رہتے ہو

آپ نے دعوتی مضامین تحریر کیے۔ جمعیت کے ترجمان کے طور پر ایک رسالہ 'عزم' کے نام سے جاری کیا۔ لاہور کے علاوہ منٹگمری (ساہیوال) جا کر بھی دروسِ قرآن دیتے رہے اور کچھ ہی عرصہ میں آپ ایک نمایاں مدرس کے طور پر مشہور ہو گئے۔ جمعیت میں فعّال سرگرمیوں کی وجہ سے پہلے ناظمِ لاہور، پھر ناظمِ پنجاب اور آخر کار ناظمِ اعلیٰ کے منصب تک پہنچے۔

جمعیت میں مختلف مناصب کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کئی تربیت گاہوں کا انعقاد کیا۔ اِن تربیت گاہوں میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے دروسِ قرآن سے خوب استفادہ کرتے رہے اور بذاتِ خود جماعت اسلامی کے تحریکی اور فکری لٹریچر کی تدریس کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔

۱۹۵۴ء میں جب ڈاکٹر صاحب نے MBBS کر لیا اور طالب علمی کا دور ختم ہوا تو اُنہوں نے جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی زندگی کا ایک دن بھی جماعت کے بغیر بسر ہو۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں اُن کی درخواست منظور ہوئی اور وہ باقاعدہ جماعت اسلامی کے رکن بن گئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر صاحب ساہیوال منتقل ہو گئے اور وہاں جماعت اسلامی کی ایک ڈسپنسری میں ملازمت اختیار کی۔ اُنہیں کچھ ہی عرصہ میں جماعت اسلامی ساہیوال کا امیر بنا دیا گیا۔

۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی میں ایک بحران کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ کئی اراکینِ جماعت نے محسوس کیا کہ جماعت کی سرگرمیوں کا رُخ رفتہ رفتہ بدل گیا ہے۔ اب فرد کی اصلاح کے بجائے زیادہ زور نظامِ حکومت کی اصلاح کی طرف ہے جس سے اراکینِ جماعت کی تربیت کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اِس حوالے سے جب بے چینی زیادہ محسوس ہونے لگی تو امیر جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف اور شیخ سلطان احمد پر مشتمل ایک جائزہ کمیٹی بنائی۔ کمیٹی کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ پورے ملک میں اراکینِ جماعت سے رابطہ کرے اور جو لوگ بے چینی محسوس کر رہے ہیں اُن کے احساسات کی ایک رپورٹ مرتب کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ایک بیان اِس کمیٹی کے حوالے کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تجزیہ کیا کہ جماعت اسلامی کا رخ انتخابی سیاست میں شامل ہونے کی وجہ سے بدل گیا ہے۔ پہلے ہماری ترجیح افراد کی ذہن سازی، تطہیرِ افکار، تزکیۂ نفس اور تعمیرِ سیرت تھی۔ اب ہمارا رُخ حکومت پر تنقید اور نظامِ حکومت کی اصلاح کی جانب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس تجزیہ کے لیے بطور دلیل جماعت کے اکابرین کی تحریروں کا ایک تقابلی

جائزہ پیش کیا۔ یہ تقابل ۱۹۴۷ء سے قبل لکھی جانے والی تحریروں اور پھر ۱۹۴۷ء کے بعد کی شائع ہونے والی تحریروں کا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے اختلافی بیان نے جماعت اسلامی کی شوریٰ کے کئی اراکین کو بہت متاثر کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا تأثر یہ تھا کہ اِس نوجوان نے ہمیں ہماری تحریروں کی صورت میں ایک آئینہ دکھا دیا ہے۔ شوریٰ کی اکثریت کی رائے تھی کہ جماعت کو انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ مولانا مودودی کو اِس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ اُنہوں نے جماعت کی امارت سے مستعفی ہونا چاہا۔ اصلاحی صاحب کا موقف تھا کہ جماعت کے فطری امیر مولانا مودودی ہیں اور جماعت صرف اُن کی امارت ہی میں کام کرسکتی ہے' البتہ مولانا مودودی کو شوریٰ کی اکثریت کی رائے پر عمل کرنا چاہیے۔ مولانا مودودی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ امیرِ جماعت' شوریٰ کی اکثریت کی رائے کا پابند ہو۔ اُنہوں نے دلچسپ بات کہی کہ آپ چاہتے ہیں کہ امامت تو میں کروں لیکن رکوع اُس وقت کروں جب شوریٰ اللہ اکبر کہے اور رکوع سے اس وقت اُٹھوں جب شوریٰ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہ کہے۔ امیر کو اراکین کو گننا نہیں تولنا چاہیے۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ اراکین شوریٰ کی اکثریت نے انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر اختلاف کی وجہ سے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرلی۔

ڈاکٹر صاحب نے جماعت سے علیحدگی کچھ عرصہ بعد اختیار کی۔ اُس کی وجہ یہ ہوئی کہ جماعت میں اظہارِ اختلافِ رائے پر پابندی عائد کردی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس کو بھی جماعت کی پالیسی سے اختلاف ہے وہ اسے صرف سالانہ اجلاس عام میں ہی بیان کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب اِس پابندی کو درست نہیں سمجھتے تھے' لہٰذا اُنہوں نے اپریل ۱۹۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔

تیسرا دور

جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد کا دور

۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۷ء

جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جماعت کی ڈسپنسری کی ملازمت ترک کردی اور ساہیوال میں اپنا مطب قائم کرلیا۔ دینی سرگرمیوں کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب

نے دروسِ قرآن کے کئی حلقے قائم کیے۔ طلبہ کے لیے ایک ہاسٹل بنایا تاکہ وہاں مقیم طلبہ کی دین کے وسیع تصوّر کے اعتبار سے ذہن سازی کی جاسکے۔ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین سے بار بار رابطے کیے تاکہ ایک نئی اجتماعیت قائم کی جاسکے جو جماعتِ اسلامی کے ابتدائی طریقۂ کار کو پھر سے اختیار کر کے افراد کی ذہن سازی اور عملی تربیت کا اہتمام کر سکے۔

ساہیوال میں قیام کے دوران تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی دو سال تک رابطہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب شبِ جمعہ کے بیان میں شرکت کرتے اور فجر کے بعد تبلیغی جماعت کے اجتماع میں دروسِ قرآن دیتے رہے۔ البتہ جب محسوس ہوا کہ تبلیغی جماعت کی اصل توجہ صرف افراد کی اصلاح پر ہے اور وہ اقامتِ دین کے لیے نہی عن المنکر بالید کا کوئی واضح پروگرام پیش کرنے کے لیے تیار نہیں تو اب ڈاکٹر صاحب کا تبلیغی جماعت سے مزید ربط جاری نہ رہ سکا۔ ساہیوال میں ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ بالا سرگرمیاں ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۲ء جاری رہیں۔

۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کو اپنی تعمیراتی کمپنی اظہار لمیٹڈ میں ڈاکٹر صاحب کی معاونت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ آپ کراچی آ کر میری کمپنی میں کچھ عرصہ معاونت کریں، اِس سے آپ مالی اعتبار سے اِس قابل ہو جائیں گے کہ بعد میں اپنے آپ کو کُل وقتی دینی سرگرمیوں کے لیے وقف کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُن کی تجویز سے اتفاق کیا اور ۱۹۶۲ء میں کراچی تشریف لے آئے۔ مذکورہ کمپنی میں آپ نے جنرل مینیجر کی حیثیت سے کام کیا۔

کراچی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب کی رہائش کچھ عرصہ کے لیے کورنگی میں دارالعلوم کراچی کے بالکل ساتھ اظہار لمیٹڈ کی فیکٹری میں رہی۔ اِس دوران ڈاکٹر صاحب کو مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مفتی رفیع عثمانی صاحب اور مفتی تقی عثمانی صاحب کی قربت بھی حاصل رہی۔ کراچی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب نے دروسِ قرآن دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ عرصہ ڈاکٹر مسعود عثمانی صاحب کے ساتھ بھی کام کیا جو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تھے۔ البتہ مسعود عثمانی صاحب کے مزاج میں توحید کے حوالے سے جو شدت تھی وہ رکاوٹ بن گئی اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اُن کا اشتراکِ عمل زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات پہلی پوزیشن کے ساتھ مکمل کیا۔

۱۹۶۵ء میں اظہار صاحب کو مالی دشواریوں کی وجہ سے بینک سے سودی قرض لینا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس پر احتجاج کیا اور اُن کی کمپنی سے قطع تعلق کر کے والد صاحب کے پاس ساہیوال آ گئے۔ والد صاحب اسی سال وفات پا گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب نے شہرِ لاہور کو اپنی دینی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔

لاہور میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی اب تک کی جمع شدہ پونجی سے کرشن نگر میں ایک مکان خریدا اور اس مکان میں اپنا مطب قائم کیا۔ مکان کی بالائی منزل پر رہائش اختیار کی اور دعوتی کتب کی اشاعت کے لیے دارالاشاعت اسلامیہ قائم کیا۔ دارالاشاعت سے ڈاکٹر صاحب نے کئی دعوتی کتب شائع کیں اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کی اشاعت کا بھی آغاز کیا۔ لاہور میں آپ نے دروسِ قرآن کے کئی حلقے قائم کیے اور جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین سے رابطوں میں تیزی پیدا کر دی تاکہ احیاءِ اسلام کے لیے ایک نئی اجتماعیت قائم کی جا سکے۔

۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے ماہنامہ میثاق کا دوبارہ اجرا کیا' جسے مولانا اصلاحی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں جاری کیا تھا لیکن اب وہ مالی دشواریوں کی وجہ سے شائع نہیں ہو رہا تھا۔ اسی سال ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کے حوالے سے اپنا اختلافی بیان ''تحریک جماعت اسلامی ..... ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ علمی حلقوں میں ایک طرف تو اس بیان کی خوب تحسین ہوئی۔ اہلِ علم نے حیرت کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے محض ۲۴ برس کی عمر میں جماعتِ اسلامی کے طریقۂ کار میں تبدیلی کا کتنا مدلل تجزیہ کیا اور معین کر کے بتایا کہ جماعت کے طریقۂ کار اور ترجیحات میں تبدیلی کا سبب کیا تھا؟

دوسری طرف علمی حلقوں کی طرف سے اُن حضرات پر شدید تنقید کی گئی جنہوں نے جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد کوئی اجتماعی جدوجہد شروع نہ کی۔ اس تنقید کا اثر ان حضرات پر یہ ہوا کہ اُنہوں نے ایک اجتماعیت کے قیام پر سنجیدہ غور و فکر شروع کر دیا۔ نتیجتاً ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خان میں اکابرین کا اجتماع ہوا۔ اس اجلاس میں ایک اجتماعیت کے قیام کے حوالے سے قرارداد تاسیس پر اتفاق ہوا۔ قرارداد تاسیس کی توضیحات کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے بہت عمدہ تقاریر کیں۔ طے پایا کہ اجتماعیت کے لیے کنوینر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ہوں گے۔ وہ پورے پاکستان کا دورہ کریں گے اور خدمتِ دین کا جذبہ رکھنے والوں کو نئی اجتماعیت کے مقاصد اور طریقۂ کار

سے آگاہ کریں گے۔ بعد ازاں اِس اجتماعیت میں شمولیت کا ارادہ کرنے والوں کا ایک ملک گیر اجتماع ہوگا جس میں اجتماعیت کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا جائے گا۔

حسبِ پروگرام مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مختلف شہروں کے دورہ پر نکلے۔ سکھر میں ایک اجتماع کے دوران اُن کی جماعت اسلامی کے ایک رکن سے تلخ کلامی ہوگئی۔ اصلاحی صاحب اِس پر دلبرداشتہ ہوگئے اور صاف کہہ دیا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ وہیں سے اُنہوں نے لاہور واپسی کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا ع ''حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے'' کے مصداق ایک اجتماعیت کے قیام کا معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بعد ازاں جب ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی قائم کی تو مذکورہ قرارداد تاسیس ہی کو تنظیم اسلامی کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔

چوتھا مرحلہ

احیاءِ اسلام کے لیے منظم اجتماعی جدوجہد کی تیاری

۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۵ء

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جب اِس بات سے نا امید ہوگئے کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین کسی اجتماعیت کے قیام کے حوالے سے آگے بڑھیں گے تو اُنہوں نے اپنے طور پر ایک اجتماعی جدوجہد کے آغاز کا عزم کیا۔ اِس حوالے سے ایک لائحۂ عمل ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے ایک تحریر میں پیش کیا۔ اِس تحریر میں اُنہوں نے واضح کیا کہ احیاءِ اسلام کے لیے کام کی دو نوعیتیں ہوں گی' ایک علمی کام اور دوسرا تحریکی کام۔

علمی کام کے لیے ایسے نوجوان تیار کرنے ہوں گے جو ایک طرف جدید علوم سے بہرہ ور ہوں اور ساتھ ہی ساتھ علوم دینی میں بھی دسترس رکھتے ہوں۔ یہ نوجوانان تخلیقی' تحقیقی' تدریسی' تبلیغی اور تصنیفی کاموں کے ذریعے تین اعتبارات سے علمی خدمات سرانجام دیں گے:

(i) مغربی فلسفہ و فکر پر مدلل تنقید کر کے اُس کا باطل ہونا ثابت کریں گے تا کہ اُس کا رعب ختم ہو۔

(ii) اسلامی تعلیمات اور تصورات کو ایسے دلائل سے مزین کر کے پیش کریں گے کہ جدید ذہن پر اُس کی حقانیت ثبت ہو جائے۔

(iii) عصرِ حاضر کے اعتبار سے اسلام کے سیاسی' معاشرتی اور معاشی نظام کو مرتب کریں گے اور وضاحت کریں گے کہ اسلام موجودہ دور میں سامنے آنے والے اجتماعی زندگی کے مسائل کا

کیا حل پیش کرتا ہے۔

تحریکی کام کے حوالے سے عوام الناس پر دینی ذمہ داریاں واضح کرنا' اُنہیں ہر سطح پر ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے متحرک کرنا' اُن کے دلوں میں نظامِ باطل کے خلاف شدید نفرت پیدا کرنا تاکہ وقت آنے پر وہ اِسے جڑ سے اکھاڑنے کے لیے میدان میں نکل آئیں' اُنہیں علمی کام کی اہمیت سے آگاہ کرنا تاکہ اِس کام کے لیے مطلوبہ صلاحیت کے نوجوان فراہم ہوں اور درکار وسائل بھی میسر آسکیں۔

ڈاکٹر صاحب کی خوش نصیبی رہی کہ اللہ نے اُنہیں اپنے لائحۂ عمل کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق عطا فرمائی۔ علمی کام کے لیے اُنہوں نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی' جس کی بعد میں کئی اور شاخیں قائم ہوئیں۔ تحریکی کام کے لیے تنظیم اسلامی قائم کی جو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی جدّوجہد کو نہ صرف جاری رکھے ہوئے ہے بلکہ بتدریج اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے رہی ہے۔

۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ''مسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق'' کے موضوع پر ایک معرکۃ الآرا تحریر صادر ہوئی۔ اِس تحریر کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب قرآنِ مجید سے دوری ہے اور پھر سے عروج کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کے حقوق ادا کر کے اُس کے ساتھ اپنے تعلق کو زندہ اور مضبوط کیا جائے۔ اِس کتاب کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے' لاکھوں کی تعداد میں یہ کتاب دنیا کے طول و عرض میں تقسیم ہوئی۔

۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء کا دور ڈاکٹر صاحب کے لیے دو اعتبارات سے بہت مشکلات کا دور تھا۔ جسمانی اعتبار سے تھکا دینے والی محنت اور مالی اعتبار سے شدت کے ساتھ وسائل کی کمی۔ ڈاکٹر صاحب درسِ قرآن کے کئی حلقے جاری رکھے ہوئے تھے۔ دروسِ قرآن کے لیے لاہور کے علاوہ ملتان' رحیم یار خان' صادق آباد' سکھر اور کراچی تک اَسفار کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۹۶۷ء سے جامع مسجد خضراء سمن آباد میں اجتماعِ جمعہ سے خطاب کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ دعوتی کتب اور ماہنامہ میثاق کے لیے مضامین کی تیاری' اُن کی کتابت' طباعت کے لیے کاغذ کی فراہمی اور پھر طباعت کے کام کی نگرانی بذاتِ خود کرتے رہے۔ اپنے مطب کی ضروریات کی فراہمی کا بوجھ بھی آپ کے کاندھوں پر تھا۔ مزید یہ کہ رہائش گاہ مطب کے ساتھ ہونے کی وجہ سے آ

کے وقت بھی مریضوں کی آمد اُن کے لیے مشقت کا باعث تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس عرصہ کے دوران ڈاکٹر صاحب کو مسلسل بخار بھی رہنے لگا تھا۔ مالی اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی جمع شدہ پونجی کا بڑا حصہ دارالاشاعت اسلامیہ میں منجمد ہوگیا۔ ماہنامہ میثاق کی اشاعت کے لیے ہر ماہ کثیر مالی وسائل درکار رہتے تھے۔

۱۹۷۰ء میں ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ ڈاکٹر صاحب کو حجازِ مقدس کا سفر کرنا پڑا۔ پاکستان میں عام انتخابات کا انعقاد ہو رہا تھا۔ جمعیت علماء اسلام کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کو صوبائی اسمبلی کے لیے ٹکٹ دینے کی پیشکش ہوئی بلکہ اِس حوالے سے کافی اصرار بھی کیا گیا۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کی طرف سے بھی حمایت کی یقین دہانی موصول ہوئی۔ اِس سے پہلے کہ منصب اور دُنیوی منفعت حاصل کرنے کی کسی نفسانی خواہش سے ڈاکٹر صاحب مغلوب ہوتے اُنہوں نے عافیت اِسی میں سمجھی کہ کچھ عرصہ کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں۔ اُنہوں نے حجازِ مقدس کے سفر کا ارادہ کیا اور پورے چار ماہ حجاز میں رہے۔ وہاں عمرہ اور حج دونوں کی سعادت حاصل کی۔

حج کے بعد حجاز ہی میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کیا۔ اُنہیں جب یہ احساس ہوا کہ وہ قمری اعتبار سے ۴۰ برس کی عمر کو پہنچ چکے ہیں تو طے کیا کہ اب بقیہ زندگی خالصتاً خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی جائے۔ نبی کریم ﷺ پر اِسی عمر مبارک میں نبوّت کا ظہور ہوا تھا اور آپ ﷺ نے اس کے بعد ایک لمحہ بھی کسبِ معاش کے لیے صَرف نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب زندگی دین کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو اُس وقت اُنہیں معاشی اعتبار سے شدید قلت کا سامنا تھا لیکن اُنہوں نے خالصتاً اللہ پر توکّل کرتے ہوئے یہ پُرعزیمت فیصلہ کیا۔ وطن واپسی کے بعد اپنا مطب بند کر دیا اور مطب کے تمام اثاثہ جات فروخت کر دیے۔

پیشِ نظر علمی کام کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی۔ دارالاشاعت اسلامیہ کے تمام اثاثہ جات انجمن نے خرید لیے جس سے ڈاکٹر صاحب کی مالی مشکلات میں کمی آئی۔ انجمن کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کو رہائش فراہم کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا کرشن نگر کا گھر کرائے پر دے دیا جس سے ڈاکٹر صاحب کے گزر اوقات کی سبیل پیدا ہوگئی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے طے کیا کہ ان کی مطبوعات پر اُن کا کوئی

حق نہیں ہوگا اور اُن سے ہونے والی تمام آمدنی انجمن کے لیے وقف ہوگی۔ اِس انجمن کے تحت ۱۹۷۵ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوگئی۔ بلاشبہ یہ اکیڈمی خدمت قرآن کا ایک بہت بڑا مرکز بن گئی جس میں بیش بہا تدریسی، تبلیغی، تصنیفی اور تحقیقی کام جاری ساری ہیں۔

تحریکی کام کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا۔

پانچواں دور

احیاءِ اسلام کے لیے منظّم اور پیہم اجتماعی جِدّوجُہد

۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۵ء میں تنظیمِ اسلامی تو قائم کردی لیکن اِس جماعت کی امارت کی ذمہ داری قبول نہیں کی بلکہ کنوینر کے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے کوئی بزرگ اِس جماعت کی امارت کا منصب سنبھالیں۔ ڈھائی سال کے انتظار کے باوجود کوئی بزرگ اِس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ بالآخر اگست ۱۹۷۷ء میں تنظیم اسلامی کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی کی امارت کی ذمہ داری قبول کی اور طے کیا کہ اِس جماعت کی اساس قرآن وسنت اور سلف صالحین کے آثار سے ماخوذ بیعتِ سمع وطاعت کے اصول پر ہوگی۔

۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے باغ جناح لاہور میں واقع مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ کا آغاز کیا۔ اِس سے قبل ڈاکٹر صاحب یہ سعادت دس سال سے مسجد خضراء سمن آباد لاہور میں حاصل کر رہے تھے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں جب دینی و سیکولر جماعتوں کے اتحاد یعنی ''پاکستان قومی اتحاد'' نے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف تحریک چلائی تو اُسے تحریکِ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نام دے دیا گیا۔ مسجد خضراء کی انتظامیہ کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اِس تحریک کی حمایت میں خطابِ جمعہ کے ذریعہ بیانات ارشاد فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب کا موقف تھا کہ یہ تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے نہیں بلکہ صرف بھٹو حکومت گرانے کے لیے ہے۔ عوام کو سڑکوں پر لانے کے لیے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ اختیار کیا گیا ہے۔ مسجد خضراء کی انتظامیہ نے ڈاکٹر صاحب کا موقف تسلیم نہیں کیا اور اُنہیں خطابِ جمعہ کی ذمہ داری سے ہٹ

دیا۔ بعدازاں وقت نے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب کا موقف کس قدر برحق تھا۔

۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لگا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اسلام کے نفاذ کو اپنی حکومت کا مقصد قرار دیا اور دینی و مذہبی رہنماؤں سے قریبی ربط وضبط رکھا۔ وہ ماضی میں ڈاکٹر صاحب کے دروسِ قرآنی میں شریک ہوتا رہا تھا' لہٰذا اُس نے ڈاکٹر صاحب کے لیے بھی پذیرائی کا خاص اہتمام کیا۔ کئی مقامات پر اعلیٰ فوجی افسران کے سامنے ڈاکٹر صاحب کو سیرت کے موضوع پر خطاب کے مواقع فراہم کیے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر اپریل ۱۹۸۱ء تا جون ۱۹۸۲ء الہدیٰ پروگرام ہر ہفتہ باقاعدگی سے نشر ہوتا رہا جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اور ان کی فکر قرآنی کا وسیع پیمانے پر تعارف ہوا۔ جون ۱۹۸۱ء میں شرعی پردہ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے موقف پر خواتین کی طرف سے مظاہرے ہوئے اور الہدیٰ پروگرام بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے متبادل کے طور پر پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں ''شامِ الہدیٰ'' کے عنوان سے دروسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جن سے کثیر تعداد میں لوگوں نے استفادہ کیا۔

۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق نے ڈاکٹر صاحب کو شوریٰ میں شمولیت کی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب نے انکار کیا تو اُس نے کہا کہ آپ مجھے مسجد کے منبر پر بیٹھ کر کے مشورے دیتے رہتے ہیں' اب میں باقاعدہ اِس کے لیے فورم بنا رہا ہوں تو آپ کیوں انکار کر رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے ضیاء الحق کی دلیل کو تسلیم کر لیا اور شوریٰ میں شامل ہو گئے۔ لیکن جلد ہی ڈاکٹر صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت شوریٰ کا ادارہ صرف خانہ پری کے لیے ہے تاکہ عالمی برادری کو تاثر دیا جائے کہ ضیاء الحق آمریت کے طور پر نہیں بلکہ مشاورت سے حکومت کا نظام چلا رہا ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے ڈھائی ماہ بعد ہی شوریٰ سے استعفا دے دیا۔

۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر صاحب نے رمضان المبارک کے دوران نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز کیا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ قرآن کی ہدایت سے آشنا ہوں۔ مزید یہ کہ رات کا طویل حصہ قرآن کے ساتھ بسر ہو' تاکہ روزِ قیامت قرآن شرکاء کے حق میں یہ سفارش کر سکے کہ یہ لوگ میری وجہ سے جاگتے رہے۔ اِس پروگرام کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی شرفِ قبولیت بخشا اور ہر سال اِس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ پروگرام کرنے کی سعادت لاہور کے علاوہ کراچی' ملتان' ابوظہبی اور امریکہ میں بھی حاصل کی۔ اب ڈاکٹر

صاحب کے کئی شاگرد ہیں جو ہر سال خدمتِ قرآنی کی اِس صورت کو جاری رکھے ہوئے ہیں

۱۹۸۴ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب نے مسجد دارالسلام باغِ جناح لاہور
''منہج انقلاب نبوی ﷺ'' کے موضوع پر خطابات کا آغاز کیا۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب
اِس موضوع پر گیارہ خطابات ارشاد فرمائے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں مر
کرلیا گیا۔ بلامبالغہ سیرت النبی ﷺ کے عملی وانقلابی پہلو کے اعتبار سے یہ خطابات کا ا
معرکۃ الآراء مجموعہ ہے۔

۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے اہل پاکستان کو خبردار کیا کہ اُنہیں آزادی حاصل
ہوئے ۴۰ برس مکمل ہو رہے ہیں۔ اگر اب بھی اسلام کی طرف پیش قدمی نہ کی تو عذابِ الٰہی
سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اِس حوالے سے اُنہوں نے ایک کتاب ''استحکام
پاکستان'' تحریر کی اور اس موضوع پر کئی شہروں میں خطابات کیے۔ قوم نے ڈاکٹر صاحب
دعوت پر لبیک نہ کہی اور اُس کے بعد سے وطن عزیز پاکستان مختلف قسم کے مسائل اور عذابو
سے دوچار ہے۔

۱۹۸۷ء میں سینیٹر مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف نے ملک میں نفاذِ شریعت
لیے سینیٹ میں ایک شریعت بل پیش کیا۔ تمام دینی جماعتیں اِس بل کی منظوری کے لیے ''متحدہ
شریعت محاذ'' کے نام سے متحد ہوگئیں۔ حکومت کو دھمکی دی گئی کہ اگر ۲۷ رمضان المبارک تک
شریعت بل منظور نہ کیا گیا تو دینی جماعتوں کے اراکین اسمبلی وسینیٹ سے استعفے دے دیں
اور حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک چلائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب اِس محاذ کی سرگرمیوں
انتہائی فعال طور پر سرگرم ہوئے۔ کراچی کے ایک جلسہ میں کئی اکابر علماء کی موجودگی میں اُنہو
نے تجویز دی کہ ہمیں منظم احتجاج کے لیے ایک امیر کی قیادت پر متفق ہونا ہوگا اور اُس سے بیعت
سمع وطاعت کرنی ہوگی۔ اُنہوں نے امیر کے لیے مولانا سمیع الحق کے والد مولانا عبدالحق
نام پیش کیا۔ افسوس کہ دیگر علماء نے شریعت کے نفاذ کی اہمیت پر تو خوب زور دیا لیکن
جدّوجہد کے لیے ڈاکٹر صاحب کی تجویز کا ذکر تک نہیں کیا۔ جب ۲۷ رمضان المبارک کی تا
آئی تو دینی جماعتوں کے اراکین نے اسمبلی اور سینیٹ سے استعفے دینے سے انکار کر دیا۔ ا
رکن اسمبلی نے کہا کہ ہم کیوں استعفے دیں، ہم دین کے دشمنوں کو اِن اداروں سے نکال باہر کر
گے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سوچ کس حد تک قابل عمل تھی؟ بہرحال دینی جماعتوں کے

طرزِ عمل نے ڈاکٹر صاحب کو شدید مایوس کیا اور ڈاکٹر صاحب نے اس روش کو ایک بہت بڑا المیہ قرار دیا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر صاحب سالانہ بنیادوں پر محاضراتِ قرآنی کا انعقاد کرتے رہے۔ یہ محاضرات اہم دینی موضوعات پر منعقد ہوئے جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء اور دانشوروں نے گراں قدر خطابات کیے اور مقالے پیش کیے۔ اِن محاضرات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے' ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوئے اور باہم دوریوں میں کمی آئی۔

۱۹۹۱ء میں امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے وطنِ عزیز کے طول وعرض میں امریکہ کے اصل عزائم یعنی ''عظیم تر اسرائیل'' کے قیام کو بے نقاب کیا۔ اِسی سال ڈاکٹر صاحب نے تحریکِ خلافت کے قیام کا اعلان کیا۔ آپ نے کئی شہروں میں ''نظامِ خلافت: کیا' کیوں اور کیسے؟'' کے موضوع پر خطابات ارشاد فرمائے۔

ستمبر ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے رفقاءِ تنظیمِ اسلامی کو آگاہ کر دیا کہ وہ قمری اعتبار سے مسنون عمر یعنی ۶۳ برس کے ہو رہے ہیں' لہٰذا اب دنیا سے رخصتی کی تیاری شروع کر رہے ہیں۔ انہوں نے بعض املاک جو اُن کے ذاتی نام پر تھی اقامتِ دین ٹرسٹ اور دینِ حق ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیں تاکہ اُن کے بعد اِن املاک پر اُن کا کوئی وارث ملکیت کا دعویٰ نہ کر سکے اور اِن املاک کا استعمال دینی مقاصد کے لیے ہوتا رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ واضح کرنے کے لیے کہ اُنہوں نے دین کی خدمت کو مالی منفعت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا ایک کتاب ''حسابِ کم وبیش'' کے نام سے تحریر کی۔ اِس کتاب میں اُنہوں نے زندگی بھر ہونے والی آمدنی اور اخراجات کا حساب پیش کر دیا۔ قبل ازیں اپنی خدماتِ قرآنی کا جائزہ پیش کرنے کے لیے ایک کتاب ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر'' تحریر کی۔ تنظیم اسلامی میں اپنے جانشین کا فیصلہ کرنے کے حوالے سے وسیع تر مشاورت کا آغاز کیا۔ مسلسل چھ برس کی مشاورت کے بعد فروری ۱۹۹۸ء میں محترم حافظ عاکف سعید صاحب کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اعلان کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اگست ۱۹۹۴ء میں حزب التحریر کے تحت عالمی خلافت کانفرنس لندن میں ''منہج انقلاب نبوی ﷺ'' کے موضوع پر انگریزی میں خطاب کیا۔ پھر ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں امریکہ جا کر انگریزی میں دورۂ ترجمۂ قرآن ریکارڈ کرایا۔

۱۹۹۷ء میں مسلم لیگ کو عام انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور اُسے قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوگئی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے میاں نواز شریف سے کئی ملاقاتیں کیں اور انہیں دستورِ پاکستان میں شامل کرنے کے لیے ایسی ترامیم مرتب کر کے دیں جس سے وطن عزیز میں اسلامی قوانین کا نفاذ ممکن ہو سکے۔ رفقاءِ تنظیم اسلامی نے بھی اِس حوالے سے بھرپور مہم چلائی اور لاکھوں کی تعداد میں مجوزہ ترامیم کا خاکہ حکومت کو بذریعہ ڈاک بھیجا۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ کی حکومت نے دستور پاکستان کو اسلامی بنانے اور اُس میں سے منافقانہ شقیں خارج کرنے کا بہترین موقع گنوا دیا۔

۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب نے قرآن اکیڈمی کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کیا جس کی ویڈیو ریکارڈنگ جدید digital کیمروں کے ذریعے کی گئی۔ یہ ریکارڈنگ Qtv اور کئی دیگر ٹی وی چینلز پر نشر ہوئی اور ۱۲۶ ممالک میں لاکھوں مسلموں اور غیر مسلموں تک قرآن کا پیغام پہنچا۔

۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب کے دونوں گھٹنوں کا آپریشن ہوا۔ اِسی سال آپ نے دینی جماعتوں کو متحد کرنے کی ایک اور کوشش کی اور متحدہ اسلامی انقلابی محاذ قائم کیا' جس کا مطالبہ یہ تھا کہ دستور پاکستان میں شریعت کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ کسی بڑی جماعت نے اِس محاذ میں شمولیت اختیار نہیں کی اور یہ کوشش بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی۔ اِس محاذ کے تحت ڈاکٹر صاحب نے کئی بڑے شہروں میں منہجِ انقلابِ نبویؐ کے عنوان سے پروگرام کیے اور جید علماء کو اِس موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے جمع کیا۔

۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے کئی عوارض اور بیماریوں کی وجہ سے تنظیم کی امارت سے معذرت کی اور امارت کی ذمہ داری محترم حافظ عاکف سعید صاحب کو منتقل کر دی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے خود حافظ عاکف سعید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔

چھٹا دور

علمی' فکری اور تبلیغی کاوشیں

۲۰۰۲ء تا ۲۰۱۰ء

تنظیم اسلامی کی امارت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنی ساری توجہ علمی' فکری اور تبلیغی امور کی طرف مرکوز کر دیا۔ روزنامہ نوائے وقت اور جنگ میں کالم تحریر

کرتے رہے' اہم ملکی اداروں میں لیکچرز دیتے رہے اور ملک کے طول وعرض میں دروسِ قرآن اور مختلف موضوعات پر خطابات ارشاد فرماتے رہے۔ جب بھی کہیں سے بیان کی دعوت آئی ڈاکٹر صاحب نے نہ فاصلوں کی صعوبتوں کو دیکھا' نہ راستوں کی دشوار گزاری کو رکاوٹ سمجھا' نہ اپنی بیماری اور معذوری کی پروا کی اور نہ ہی اپنی پیرانہ سالی کی کمزوریوں کو عذر بنایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر ایسی دعوت پر لبیک کہا اور جا کر اللہ کا پیغام پورے جذبہ کے ساتھ پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔

۲۰۰۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے مایہ ناز اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر بھارت کا دورہ کیا اور ممبائی میں بڑے بڑے عوامی اجتماعات سے کئی کئی گھنٹے خطاب کیا اور اسٹوڈیو میں کئی لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ Peace ٹی وی چینل پر یہ خطابات اور لیکچرز نشر ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھارت کے کئی دیگر شہروں میں بھی خطابات و دروس کی سعادت حاصل کی۔ ۲۰۰۹ء میں جنوبی افریقہ کا دورہ کیا اور وہاں بھی کئی مقامات پر خطابات ارشاد فرمائے۔

مورخہ ۴ تا ۹/اپریل ۲۰۱۰ء تنظیم اسلامی کے ذمہ داران کا ایک تربیتی کورس قرآن اکیڈمی فیصل آباد میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کورس کے مجوزہ نصاب کو بہت پسند کیا اور خود بھی اس کورس میں ہمہ وقت شرکت کرنے اور چند اہم مضامین پڑھانے کا ارادہ کیا۔ اُنہوں نے ۴ اور ۵/اپریل کو دو دو گھنٹے کے دورانیہ پر مشتمل پروگرام کیے۔ ۵/اپریل کی شام کو بھی ایک پروگرام کے لیے پوری تیاری سے تشریف لائے لیکن بجلی کے نظام کی خرابی کی وجہ سے یہ پروگرام نہ ہو سکا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب اس انتظار میں کہ شاید بجلی بحال ہو جائے تشریف فرما رہے۔ کمر کی تکلیف کے ساتھ طویل وقت تک بیٹھنا ڈاکٹر صاحب کے لیے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ رات سوتے وقت کمر سے درد کے مارے ایسی ٹیسیں اٹھیں کہ ڈاکٹر صاحب تڑپ اُٹھے اور اُن کی چیخیں نکلتی رہیں۔ ۶/اپریل کو دن ۱۱ بجے تشریف لائے اور اعلان کیا کہ اب میرے لیے مزید اس کورس میں وقت دینا ممکن نہیں رہا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ شاید میری یہ آپ سے آخری ملاقات ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے شرکاء کے چند سوالات کے جوابات دیے اور اس دوران بھی بار بار اُن پر رقت طاری ہوتی رہی۔ آخر میں ایک ساتھی کی درخواست پر دعا کرائی اور دُعا کے دوران بلک بلک کر روتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی دعائیں قبول فرمائے اور اُن پر اپنے لطف وکرم کی بارش فرمائے۔ آمین!

۹/اپریل کو قرآن اکیڈمی لاہور کی جامع القرآن میں حسب معمول خطاب جمعہ ارشاد فرمایا۔ ۱۰/اپریل کو فیصل آباد ہی میں تنظیم کی مرکزی شوریٰ کا اجلاس تھا۔ ڈاکٹر صاحب باوجود بیماری اور نقاہت کے اِس اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور سے تشریف لائے۔ فرمایا کہ شاید آخری بار آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ یہ پیغام دینے کے لیے آیا ہوں کہ اِس ظالمانہ نظام کے خلاف اپنے جذبات کو سرد نہ ہونے دینا اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے اپنی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرنا۔ یعنی ساتھیو! مشعلوں کو تیز کرو! حالات بڑی تیزی سے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ دین' ملت اور ملک کے خیر خواہوں کو چاہیے کہ اپنے زیادہ وسائل' اوقات اور توانائیاں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اِس وصیت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مورخہ ۱۳/اپریل کو رات ساڑھے گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کے فرزند ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کو بخار ہے۔ اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا کسی معالج کو دکھا دیا جائے؟ ڈاکٹر صاحب نے منع فرمایا اور چند ادویات لے کر سو گئے۔ رات ڈھائی بجے ڈاکٹر صاحب کے خادم نے محسوس کیا کہ آپ کے سانس کی آواز نہیں آ رہی۔ قریب جا کر دیکھا تو آپ ساکت پڑے تھے۔ خادم نے ڈاکٹر عارف رشید صاحب کو فون کر کے بلایا۔ اُنہوں نے آ کر ڈاکٹر صاحب کا معائنہ کیا اور بتایا کہ اللہ کے دین کا خادم اللہ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر کرم کیا اور اُس پر موت کی سختیوں کو آسان فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی خدمت والی زندگی اور راحت والی موت عطا فرمائے۔ آمین!

حرفِ آخر:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب پر بے مثال عنایات کی بارش کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت قول و فعل میں مطابقت' اصولوں پر سختی سے عمل' کلمۂ حق کہنے کی زبردست جرأت' خودداری' قناعت' سادگی' استقامت' بے پناہ قوتِ عمل اور نیک مقاصد کے ساتھ سچی لگن سے آراستہ تھی۔ اُن کی زندگی پاکیزگی کا ایک انمول نمونہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک قرآن مبین و دین متین کی خدمت کی لائقِ تحسین داستان ہے۔ زندگی کی آخری ساعتوں تک اللہ کی کتاب کی تبلیغ اور اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد ایک بہت بڑی سعادت

(باقی صفحہ 96 پر)

اسرار بھائی —— رفتید و لے نہ از دلِ ما

پروفیسر خورشید احمد ☆

۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء میں سینیٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ابھی راستہ ہی میں تھا کہ موبائل فون سے 'مختصر پیغام' پڑھ کر دل سے ایک آہ نکلی —— اسرار بھائی ایک عالم کو سوگوار چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے —— اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

'مختصر پیغام' بھیجنے والے نے ڈاکٹر اسرار احمد کی حرکتِ قلب کے بند ہونے سے انتقال کی خبر اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اسلام آباد میں ہونے کی وجہ سے آخری دیدار اور نمازِ جنازہ میں شرکت سے محروم رہا' لیکن دل کی گہرائیوں سے ان کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لیے دعائیں کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر بھر کی مساعی کو شرفِ قبولیت سے نوازے' بشری لغزشوں سے عفو و درگزر فرمائے' ان کی قبر کو گوشۂ فردوس بنا دے اور ابدی زندگی میں ان کو جنت کے اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے' آمین' ثم آمین!

اسلامی جمعیت طلبہ کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں۔ بلاشبہہ ان میں سب سے اہم زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اہداف کا شعور اور رب کی رضا کے حصول کے لیے اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے کا عزم' شوق' کوشش اور دین حق کی شہادت اور اس کے قیام کی جدوجہد کے لیے زندگی کو وقف کرنے کا عہد ہے۔ تاہم عام لوگوں کی نظر میں بظاہر ایک معمولی اور حقیقت میں بڑا ہی قیمتی احسان یہ بھی ہے' کہ اس کی آغوش میں شعور کی منزلیں طے کرنے والے ایک ایسے رشتۂ اخوت میں جُڑ جاتے ہیں' جسے زمانے کی کروٹیں اور اختلافات کے طوفان بھی کمزور نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد ایک عالمِ دین' ایک داعیٔ خیر' ایک معتبر شخصیت ہونے کے ساتھ 'ڈاکٹر اسرار' ہی ہوں گے' لیکن میرے لیے اور جمعیت کی پوری برادری کے لیے وہ اوّل و آخر اسرار بھائی تھے' ہیں اور رہیں گے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

☆ مدیر ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

میری اور اسرار بھائی کی پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع منعقدہ لاہور میں ہوئی۔ میں جمعیت کا نیا نیا رکن بنا تھا اور ساتھ ہی کراچی جمعیت کی نظامت کا بار ڈال دیا گیا تھا۔ اسرار بھائی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے غالباً پہلے سال میں تھے۔ برادرم ظفر اللہ خان جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے اور ہماری سرگرمیوں کا گہوارا محترم نصر اللہ خان عزیز صاحب کا گھر تھا۔ اس ملاقات میں جن تین ساتھیوں نے بہت متاثر کیا ان میں نسیم بھائی' اسرار بھائی اور مسلم سرحدی نمایاں تھے۔ اخوت کا جو رشتہ اس موقع پر قائم ہوا' اُس نے ساری عمر ہم کو ایک دوسرے کے لیے اسرار بھائی اور خورشید بھائی ہی رکھا—— اگرچہ ۶۰ سال کے اس طویل عرصے میں اتفاق اور اختلاف' قربت اور عدم ارتباط کے شیریں اور تلخ لمحات سفینۂ حیات کو ہچکولے دیتے رہے۔ جمعیت میں ہم نے چار سال ساتھ گزارے۔ ۱۹۵۰ء میں نسیم بھائی ناظم اعلیٰ بنے' ۱۹۵۱ء میں خرم بھائی' ۱۹۵۲ء میں اسرار بھائی' اور ۱۹۵۳ء میں یہ ذمہ داری میرے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ پھر جماعت اسلامی میں بھی ہمارا ساتھ رہا۔ ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں میرے اور ان کے موقف میں بڑا فرق تھا' لیکن ذاتی محبت کا جو رشتہ ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا تھا وہ کبھی نہ ٹوٹا: اَلْحَمْدُلِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

اسرار بھائی اور میں ایک ہی سال اس دنیا میں آئے۔ وہ جمعیت میں میرے سینئر رہے۔ تقسیم سے قبل اسرار بھائی رہتک' ہریانہ میں ابتدائی تعلیم اور تحریک پاکستان میں شرکت کے مراحل سے گزرے۔ میں نے دہلی میں آنکھیں کھولیں اور وہاں تحریک پاکستان میں بھرپور شرکت کی۔ ہمارے یہ ابتدائی تجربات زندگی کے رُخ کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنے لیکن اصل فیصلہ کن دور' اسلامی جمعیت طلبہ میں گزارے ہوئے چند سال ہی رہے۔ پہلے دن سے اسرار بھائی کی خطابت اور خود اعتمادی کا نقش دل پر ثبت ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اسرار بھائی کو دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ علمی' دعوتی اور تنظیمی' تینوں اعتبار سے وہ منفرد شخصیت کے حامل تھے۔ قرآن سے شغف اور زبان و بیان پر قدرت کے باب میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ بے پناہ خود اعتمادی کے حامل تھے جو کبھی کبھی شدتِ اظہار میں غلط فہمی کا باعث بھی ہو جاتی تھی اور قائدانہ صلاحیت جو ان کو نمبر ایک پوزیشن سے کم پر ٹھہرنے نہیں دیتی تھی' ان کے مزاج اور کردار کی امتیازی شان تھے۔

وہ ایک اچھے اور مہربان ڈاکٹر تھے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے طبّی علاج معالجے سے

کہیں بڑا کام لینا تھا۔ علامہ اقبال' مولانا مودودی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی فکر اور شخصیت کی صورت گری میں اہم کردار ادا کیا۔ دین کا جامع تصور ان کے رگ و پے میں سما گیا تھا۔ پھر اپنی محنت اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی فیضان سے انھوں نے قرآن کریم کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اسلامی انقلاب کے طریق کار کے بارے میں انھوں نے مولانا مودودی کے تجزیے اور عملی جدوجہد سے اختلاف کیا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ جماعت سے رشتہ توڑ لینے کے باوجود وہ زندگی کے ہر دور میں' اور اپنے آخری لمحے تک اسلام کے انقلابی تصورِ دین کے علم بردار رہے۔ اپنے علم اور ادراک کے مطابق پورے خلوص' یکسوئی اور جانفشانی کے ساتھ قرآن کے پیغام کو انسانوں تک پہنچانے اور دین کو غالب قوت بنانے کی جدوجہد میں شریک رہے۔ اسی جہادِ زندگانی میں جاں جانِ آفریں کے سپرد کی۔

اسرار بھائی نے جدید اور قدیم' دونوں علوم سے بھرپور استفادہ کیا اور اس علم کو دعوتِ دین کے لیے بڑی کامیابی سے استعمال کیا۔ ان کی شخصیت کے سب سے اہم پہلو ان کی یکسوئی' خود اعتمادی اور خدمتِ دین کے لیے خطابت تھے۔ قرآن کو انھوں نے اپنا وظیفۂ حیات بنا لیا تھا۔ اس کے پیغام کو گہرائی میں جا کر سمجھا تھا اور جس بات کو حق جانا اس پر نہ صرف خود قائم ہوئے' بلکہ دوسروں کو بھی اس کے قیام کی منظم جدوجہد میں شریک کیا۔ ان کے درسِ قرآن کے پروگرام ملک اور ملک سے باہر دعوت کا اہم ذریعہ بنے۔ پھر الیکٹرانک میڈیا پر قرآن کے پیغام کو پھیلانے کے لیے انھوں نے منفرد خدمات انجام دیں۔ بلاشبہہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تحریر کی صلاحیت سے بھی نوازا تھا' تاہم ان کی تحریر میں بھی خطابت کی شان نمایاں رہی۔ جو کتابیں انھوں نے جم کر لکھی ہیں' وہ ہر اعتبار سے علمی شاہکار ہیں۔ البتہ ان کے لٹریچر کا بڑا حصہ ان کی تقاریر اور دروسِ قرآن کا مرہونِ منت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ تنظیمی اور قائدانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اور انھوں نے اسلامی جمعیت طلبہ' انجمن خدام القرآن' تنظیم اسلامی اور عالمی تحریکِ خلافت کے ذریعے اپنی بہترین صلاحیتیں دین کی خدمت میں صَرف کیں۔ یہ بھی ان پر اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام تھا اور بلاشبہہ ان کی شعوری کوششوں کا بھی اس میں بڑا دخل تھا کہ ان کا پورا خاندان دینِ حق کی خدمت میں ان کا شریکِ سفر تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور جو چراغ انھوں نے جلائے

ہیں وہ ہمیشہ روشن رہیں۔ گذشتہ کئی سال سے ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میری آخری ملاقات ان سے امریکا میں ہارٹ فورڈ سیمینری میں ہوئی' جہاں مجھے لیکچرز کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے حلقے سے چند نوجوانوں کے ذریعے جو میرے لیکچرز میں بھی شریک تھے' ان کے ساتھ ایک شام گزارنے کا موقع ملا۔ پروفیسر ابراہیم ابوربیعہ کے گھر پر ہم نے اکٹھے کھانا کھایا اور پرانے تعلقات کی تجدید کی۔

اختلافی امور پر بھی ملک میں اور ملک سے باہر بھی بارہا بات ہوئی' لیکن محبت اور اعتماد کا جو رشتہ ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا تھا' وہ زندگی بھر قائم رہا۔ یہ سب اللہ کا فضلِ خاص اور طریق کار کے بارے میں اختلاف کے باوجود اصل مقصد کے اشتراک اور باہمی اخوت اور اعتماد کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔

سازِ دل چھیڑ کے بھی' توڑ کے بھی دیکھ لیا
اس میں نغمہ ہی نہیں کوئی محبت کے سوا

بقیہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ — حالاتِ زندگی اور خدماتِ دینی

ہے جو ڈاکٹر صاحب کے حصہ میں آئی۔ ایسی زندگی بلاشبہ حافظ شیرازی کے اِس شعر کا مصداق نظر آتی ہے کہ:

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!

''میں نے اپنی زندگی کا کل سرمایہ محبوب کی راہ میں نچھاور کر دیا۔ میں خوش ہوں اپنی بیتی ہوئی زندگی سے کہ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اُن کے مشن کو نہ صرف زندہ و جاری رکھا جائے بلکہ تیز سے تیز تر کیا جائے اور اُن کے لیے صدقۂ جاریہ بننے کی سعادت حاصل کی جائے۔ عنقریب روزِ قیامت ہمیں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہونا ہے۔ یہ ملاقات خوشگوار ہوگی اگر ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مشن سے وفا کی۔ اِس کے برعکس اگر اِس مشن سے پہلوتہی کی تو ڈاکٹر صاحب سے آنکھیں چار کرنا ممکن نہ رہے گا اور ہمیشہ ہمیش کی شرمندگی ہماری گردن کا طوق بن جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِس رسوائی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

ooo

موت العالم موت العالم

ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم

''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!''

حافظ محمد ادریس ☆

اگلی صفوں کا مسافرِ حق

ڈاکٹر اسرار احمد ۱۳ اور ۱۴ اپریل کی درمیانی رات کو حرکت قلب بند ہو جانے سے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ڈاکٹر صاحب محض ایک فرد نہیں' انجمن تھے۔ وہ زندگی بھر جہاں بھی رہے' جدوجہد کا وطیرہ اپنائے رکھا اور جدوجہد بھی ہمیشہ اگلی صفوں میں رہ کر کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی صلاحیتیں اور بلند حوصلہ بخشا تھا کہ پیچھے رہنا اور ہمت ہار کر بیٹھ جانا ان کی لغت میں نہیں تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپریل ۱۹۳۲ء میں مشرقی پنجاب کے معروف قصبے حصار میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے وقت ہجرت کر کے پاکستان پہنچنے والے قافلوں میں وہ اور ان کا خاندان بھی شریک تھا۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت تک میٹرک کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ پاکستان آ کر انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا اور ایف ایس سی کے بعد پاکستان کے سب سے بڑے اور قدیم میڈیکل کالج کنگ ایڈورڈ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔

علمِ دین کا جویندہ

یہ تو ڈاکٹر صاحب کی پروفیشنل تعلیم تھی۔ مرحوم کی پرورش ایسے دینی گھرانے اور ماحول میں ہوئی تھی جہاں اسلام سے محبت اور علوم دینی سے شغف معمولاتِ زندگی کا حصہ تھا۔ گھر میں دینی کتب اور اس دور میں چھپنے والے اسلامی رسائل و جرائد موجود ہوتے تھے۔ اسی گھریلو ماحول اور خاندانی پس منظر کا کمال تھا کہ انہوں نے اپنے طور پر اسلامیات میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا اور پرائیویٹ طالب علم کے طور پر کراچی یونی ورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں اس امتحان میں

☆ ادارہ معارف اسلامی' منصورہ' لاہور E-mail:maarif_e_islami@yahoo.com

جامعہ میں اوّل پوزیشن لے کر ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب اس کے ساتھ دورۂ حدیث کے نصاب کو بھی سبقاً سبقاً پڑھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے بھی انہوں نے بھرپور کاوش کی اور خود کو دینی علوم کے سمندر کا شناور بنالیا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب فقہی امور و معاملات میں بڑے محتاط رہے اور یہ ان کی انتہائی حکیمانہ پالیسی تھی۔ ایک اسلامی تنظیم کے سربراہ ہوتے ہوئے بھی ایسے معاملات میں وہ ہمیشہ معروف علمائے دین اور مفتیان کرام ہی کی طرف لوگوں کو راہ نمائی دیا کرتے تھے۔

عملی جدّوجُہد کا آغاز

ڈاکٹر صاحب کا تعلق جس خاندان سے تھا' اس میں عصری تعلیم کا رجحان شروع ہی سے پایا جاتا تھا۔ ان کے بڑے بھائی جناب اظہار احمد اپنے دورِ طالب علمی میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم لیگ کی تحریک آزادی کے حامی ہونے کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے رسالہ ترجمان القرآن اور ان کے قلم سے منظرِ عام پر آنے والی تصانیف کے بھی شیدائی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنے برادرِ بزرگ کی وساطت اور تربیت کے نتیجے میں اس وادی میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے بطور طالب علم اپنی جدوجہد کا آغاز مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے کیا۔ مرحوم کو اپنے برادرِ بزرگ اظہار صاحب ہی کے ذریعے سے ترجمان القرآن سے شناسائی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب خود فرماتے ہیں: ''جب ہم حصار میں فسادات کے دوران محصور رہے تو اُس وقت میرے بڑے بھائی صاحب اور میں نے مل کر ترجمان القرآن میں اُس وقت تک تفہیم القرآن کے شائع ہونے والے حصوں کا اجتماعی مطالعہ شروع کیا۔ سورۂ یوسف اس وقت شائع ہو رہی تھی' اس کے مضمون اور تفسیر کے اسلوب سے گہرا اثر قبول کیا''۔ بعد میں ڈاکٹر اسرار صاحب کی زندگی جس سانچے میں ڈھلی اسے ان کے ممدوح علامہ اقبال کے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے: ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

اسلامی جمعیت طلبہ میں

ڈاکٹر صاحب لاہور آنے کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ سے متعارف ہوئے۔ پھر میڈیکل کالج' لاہور اور حلقۂ پنجاب کی نظامت کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ ان کی یہ وابستگی ۱۹۵۰ء میں

شروع ہوئی۔ بہت مختصر وقت یعنی نومبر ۱۹۵۲ء میں وہ جمعیت کے ناظمِ اعلیٰ منتخب ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے انتخاب سے قبل جمعیت کا دستور تیار ہو چکا تھا۔ گویا اس دستور کے تحت وہ پہلے ناظمِ اعلیٰ قرار پائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت قلیل عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں وہ نظامتِ اعلیٰ سے سبکدوش ہو گئے' تاہم اپنی تعلیم کے آخری لمحات تک جمعیت کے ساتھ رکنیت کا تعلق قائم رہا۔ ڈاکٹر صاحب کی جمعیتی زندگی میں فروری ۱۹۵۲ء میں پنجاب جمعیت کا صوبائی اجتماع برکت علی اسلامیہ ہال میں منعقد ہوا۔ مولانا مودودیؒ کا مشہور کتابچہ ''اسلامی نظامِ تعلیم کے نفاذ کی عملی تدابیر'' اسی اجتماع میں کی گئی تقریر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا کے یہ الفاظ بہت اپیل کرتے تھے: ''آپ لوگ دین کے کام میں بھی پیش پیش ہوں اور تعلیم کے میدان میں بھی پیچھے نہ رہیں بلکہ دوسروں سے آگے ہوں''۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول ان الفاظ کی تشریح کے لیے وہ مولانا سے ملنے کے لیے ان کی رہائش گاہ پر گئے۔ (بحوالہ: جب وہ ناظم اعلیٰ تھے' حصہ اوّل' صفحہ ۹۳)

جماعت اسلامی میں شمولیت اور علیحدگی

ڈاکٹر صاحب تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جماعت اسلامی میں شامل ہوئے۔ آپ کی رہائش ساہیوال میں تھی۔ وہ مقامی جماعت ساہیوال کے امیر بھی رہے۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب ساہیوال سے لاہور منتقل ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں جماعت کی انتخابی پالیسی سے اختلاف پر جماعت سے الگ ہو گئے۔ جماعت سے الگ ہونے کے بعد قرآن اور اقبال کو گہری نظر سے سمجھنے کے لیے ان دو اہم علوم کی تحصیل کے لیے جت گئے۔ وہ بطور میڈیکل ڈاکٹر کرشن نگر میں پرائیویٹ کلینک بھی کرتے تھے مگر ساتھ ساتھ درسِ قرآن کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ راقم الحروف کی ڈاکٹر صاحب سے پہلی ملاقات ان کے کلینک پر ہی ۱۹۶۸ء کے موسم گرما میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق پہلے بھی تھا مگر میں بطور ناظم جمعیت لاہور' جمعیت کے رہائشی حلقوں میں ساتھیوں سے ملنے کے لیے شہر کا دورہ کیا کرتا تھا۔ ایک روز اس علاقے میں بھی جانا ہوا۔ اپنی سادگی کا یہ عالم کہ ٹائیفائیڈ بخار کے باوجود اس پروگرام پر پہنچ گیا۔ دوستوں نے جب بتایا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کا کلینک قریب ہی ہے تو میں نے کہا چلو ''ایک پنتھ دو کاج'' ان سے دوائی بھی لیتے ہیں اور تعارف اور شناسائی بھی حاصل کرتے ہیں۔

یادگار محبت واخوت

ڈاکٹر صاحب نے اس پہلی اور اچانک ملاقات میں جس محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا وہ تو اپنی جگہ ایک یادگار واقعہ ہے ہی' مگر کمال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک معمولی سے طالب علم کے ساتھ ہونے والی اس پہلی ملاقات کو یاد رکھا اور کئی مرتبہ ملاقاتوں میں اس کا تذکرہ فرمایا۔ خوشی وغم کے موقع پر ڈاکٹر صاحب منصورہ تشریف لاتے اور ہم بھی ان کے ہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہمارے بزرگ رکن جماعت جناب اللہ بخش سیال صاحب (صادق آباد) ڈاکٹر صاحب کے بہنوئی ہیں۔ ان کی تمام بیٹیاں جماعت کی سرگرم کارکن اور رکن ہیں' اور سب بیٹے تنظیم اسلامی میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ سیال صاحب جماعت کے پختہ رکن ہیں مگر ڈاکٹر صاحب کے مضامین اور لٹریچر کے فروغ کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ وہ جماعت اور تنظیم کے درمیان ''حمزۃ الوصل'' کا کام کرتے ہیں۔ چند سال قبل محترم قاضی حسین احمد صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سے ان کی بھاوج مرحومہ (بیگم اظہار احمد مرحوم) کی وفات پر تعزیت کے لیے ہم حاضر ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے قاضی صاحب کو بھی خصوصی طور پر ۱۹۶۸ء کی اس پہلی ملاقات کے بارے میں نہایت محبت و پیار سے تفصیلات بتائیں۔ اس پہلی ملاقات میں جمعیت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے اپنی وابستگی اور محبت کا اظہار کیا اور ساتھ ہی بہت شائستہ انداز میں جماعت کی قیادت اور پالیسیوں سے اپنے اختلاف کا تذکرہ بھی کیا۔ اسی گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے یہ عندیہ بھی دیا کہ وہ اپنی پریکٹس چھوڑ کر خود کو مستقل طور پر قرآن کی خدمت کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں۔

جذبۂ عشق وجنوں

اُس وقت مجھے یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ ایک میڈیکل ڈاکٹر اپنا کلینک بند کر کے خود کو کیسے ایڈجسٹ کرے گا' مگر بعد میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے مقصد کے ساتھ عشق کی حد تک وابستگی کے عملی مظاہرے کرتے ہوئے دیکھا تو یقین ہو گیا کہ اخلاص اور استقامت انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ کشتیاں جلا دینے والے تاریخ میں ہمیشہ سرخرو رہے ہیں۔ سبک سارانِ ساحل گوشۂ عافیت میں رہتے ہیں۔ عشق کی بازی میں سب کچھ لگا دینا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تاریخی فیصلے کے بعد انجمن خدام القرآن کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کا مقصد نوجوانوں اور عوام کو عربی زبان اور قرآنی تعلیمات سے روشناس کرانا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں ڈاکٹر صاحب

نے ایک جامع مسجد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جہاں اب تک ان کے مرکزی دفاتر اور قرآن اکیڈمی کی کلاسیں جاری وساری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے باغِ جناح میں خطبۂ جمعہ دینا شروع کیا تو وہ بہت مقبول ہوا' جس میں دن بدن حاضری بڑھتی چلی گئی۔ ہر طبقۂ فکر کے لوگ ان کا خطبہ سننے کے لیے آتے تھے' ان میں اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا انداز علمی اور استدلال انتہائی معقول اور منطقی ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۵ء میں اپنی غیر سیاسی جماعت تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی۔ اس کے ذریعے وہ سیاست میں حصہ لیے بغیر ملک میں نظامِ خلافت قائم کرنے کا تصور پیش کرتے تھے۔ اس تصور میں بہت سے خلا تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے عزم میں انتہائی پختہ اور مخلص تھے کہ وہ اپنی اس جدوجہد کے نتیجے میں نظامِ خلافت کے قیام کو ممکن قرار دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اور سیاست

موجودہ جمہوری طریق انتخاب اور اس کے تحت وجود میں آنے والے نظام سے ڈاکٹر صاحب کو کبھی حسنِ ظن نہیں رہا۔ جماعت اسلامی سے علیحدگی بھی اسی نکتے پر ہوئی تھی۔ تاہم یہ بات ریکارڈ پر لانا ضروری ہے کہ جماعت سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود کمال یکسوئی اور اپنائیت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب دروسِ قرآن میں ہماری دعوت پر بلاہچکچاہٹ شریک ہو جاتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک ہی سٹیج پر بیٹھ کر وہ جماعت کی پالیسی اور سیاسی منشور پر ہماری گفتگو مکمل صبر وتحمل سے سنتے تھے۔ اسی طرح وہ انتخابات میں خود حصہ نہ لینے کے باوجود اچھے امیدواروں کے حق میں ووٹ کے استعمال کو درست سمجھتے تھے۔ ہمارے سیاسی شعبے میں سرگرم عمل احباب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے وابستگان ہمیشہ جماعت کے باکردار نمائندوں کو ووٹ دیا کرتے تھے۔ اس موضوع پر مجھے ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف ۲۰۰۲ء کے انتخابات سے قبل حاصل ہوا۔ اس زمانے میں دینی جماعتوں کا سیاسی اتحاد ''متحدہ مجلسِ عمل'' وجود میں آچکا تھا۔ صوبہ پنجاب کی صدارت جماعت کے سپرد تھی۔ اسی حیثیت میں میں ان تمام دینی جماعتوں اور تنظیموں سے ملا جو براہِ راست انتخابات میں حصہ نہیں لیتی تھیں۔ ان میں مجلسِ احرار' تنظیم اسلامی اور جمعیت اشاعت التوحید والسنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معقول شرائط

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ان کے قرآن اکیڈمی والے دفتر میں ہوئی۔ میں اس وقت

جماعت اسلامی صوبہ پنجاب کا امیر تھا۔ میرے ساتھ جماعت اسلامی کے مرکزی نائب قیم ملک محمد اشرف اور لاہور کے بعض ذمہ دارانِ جماعت بھی شریک وفد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں خوش آمدید کہا اور انتخابات میں حمایت کے ہمارے مطالبے پر وہ کہنے لگے: ''ہم آپ لوگوں کی حمایت ضرور کریں گے مگر وہ مشروط ہوگی''۔ ڈاکٹر صاحب نے جو دو شرطیں بیان فرمائیں' وہ یہ تھیں:

(۱) دینی جماعتوں کا یہ اتحاد اگر ٹکٹوں کی تقسیم پر آپس میں بٹ گیا اور متفقہ فیصلے نہ ہوئے تو ہم حمایت نہیں کریں گے۔

(۲) اس اتحاد میں کسی سیکولر گروہ کو شامل کیا گیا تو بھی ہم اس اتحاد کے امیدواروں کی حمایت نہیں کریں گے۔

تاریخی حوالہ اور سفر بسلامت

ہم نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ان کی شرائط نہایت مناسب اور وزنی ہیں۔ پھر ان کو یقین دلایا کہ ان شاء اللہ ان کی دونوں شرائط کو نہ صرف ملحوظ رکھا جائے گا بلکہ ان کی پابندی ہوگی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر ''ایں خیال است و محال است و جنوں''۔ پھر انہوں نے مثال دی کہ مولانا مودودیؒ اور نوابزادہ نصر اللہ خاں کے درمیان ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل کافی افہام و تفہیم اور تعاون تھا' مگر لاہور کی ایک نشست پر فرزندِ اقبال اور جنرل سرفراز خان کے ناموں پر اتفاق نہ ہو سکا اور یوں دو جماعتیں اور دو بڑی شخصیات افتراق کا شکار ہو گئیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ بلاشبہ جس تاریخی واقعہ کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ افسوس ناک تھا مگر اللہ کی رحمت سے مجھے امید ہے کہ اس دفعہ ہم متحدہ کر سرخ رو ہوں گے۔ فرمانے لگے اللہ کرے ایسا ہو!

ٹکٹوں کی تقسیم پر جب تمام جماعتیں فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھیں تو کئی مواقع پر بڑے نازک مرحلے آئے مگر الحمدللہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے اور متحدہ مجلسِ عمل ایک جھنڈے' ایک منشور اور ایک انتخابی نشان کے ساتھ میدان میں اتری۔ یوں یہ کٹھن سفر تو بسلامت طے ہو گیا مگر اگلے مراحل میں دل پر شکم غالب آ گیا اور ایک دلدوز باب تاریخ کا حصہ بن گیا۔ بہرحال یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی تنظیم نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ خوب نبھایا اور بھرپور تعاون کیا' بالخصوص لاہور اور اسلام آباد میں تو ان کے قائدین اور کارکنان نے جو تعاون کیا وہ اب تک ایک خوشگوار یادگار ہے۔

ڈاکٹر صاحب اور اقبال

ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کو خوب پڑھا اور پھر ہر موقع پر اپنی گفت گو' خطاب اور تحریروں میں کلامِ اقبال سے برمحل خوب استشہاد کیا۔ قاضی حسین احمد بھی اقبال شناس اور کلامِ اقبال کے حافظ و ماہر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں اور خطابات میں جا بجا اقبال کے اشعار نگینوں کی طرح چمکتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کی شوکتِ رفتہ پر اقبال نے جن جذبات کا اظہار کیا اور اسے دوبارہ پالینے کا جو حسین خواب دیکھا' اس کے لیے بشارتیں سنائیں' امید کی کرنیں روشن کیں اور سوئے ہوؤں کو جگانے کے لیے حدی خوانی و نغمہ سرائی کی' انہی کو ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھایا اور سچی بات یہ ہے کہ خوب بڑھایا۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ راقم کی رائے ہے کہ جامعات کے طلبہ و طالبات کو اپنے علمی و تحقیقی مقالہ جات کے لیے اس موضوع کو منتخب کر کے اس پر تحقیق کا حق ادا کرنا چاہیے۔

ادارے اور جرائد

ڈاکٹر صاحب نے انجمن خدام القرآن اور ماہنامہ ''میثاق'' کے ذریعے دروسِ قرآن اور مضامین قرآن کو عام کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ رسالہ سال ہا سال سے باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ ماہِ اپریل کے شمارے میں بھی ڈاکٹر صاحب کے دو مضامین شامل ہیں۔ بعد میں باقاعدہ ایک تدریسی ادارے کے طور پر ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی وجود میں لائی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تصورِ خلافت کو مزید اُجاگر کرنے کے لیے ہفت روزہ رسالہ ''ندائے خلافت'' بھی جاری کیا جو بہت اچھے اور علمی مضامین سے مزین ہر ہفتے اپنے قارئین کے علم و ایمان کو جلا بخشتا ہے۔ اسلامی صحافت میں یہ ایک بہت اچھا اضافہ ہے☆۔ ڈاکٹر صاحب جماعتِ اسلامی سے اگرچہ نکل گئے تھے مگر جماعت کے مختلف پروگراموں بالخصوص فہم قرآن اور تربیت گاہوں میں درسِ قرآن کے لیے ہم انہیں مدعو کرتے رہتے تھے اور وہ بڑی محبت سے ان پروگراموں میں شرکت کرتے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کئی بار ایک سٹیج سے سامعین سے گفتگو کا شرف حاصل ہوتا رہا۔

☆ رسائل و جرائد کے ضمن میں یہاں ''حکمت قرآن'' کا ذکر ہونے سے رہ گیا ہے۔ ماہنامہ حکمت قرآن محترم ڈاکٹر صاحب کی ادارت میں ۱۹۸۲ء سے مسلسل شائع ہوتا رہا ہے' جسے ۲۰۰۸ء سے سہ ماہی مجلے کی صورت دے دی گئی ہے۔ (ادارہ میثاق)

الہدیٰ

ڈاکٹر صاحب کا پی ٹی وی پر دروسِ قرآن کا سلسلہ ''الہدیٰ'' کے نام سے اتنا مقبول ہوا کہ دور دراز کے علاقوں تک ان کا پیغام پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان سے باہر بھی اپنے دوروں میں پبلک پروگراموں اور دروسِ قرآن کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم سامعین کو قرآن کا ابدی پیغام پہنچانے کی کامیاب کوشش کرتے رہتے تھے۔ غالباً ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر صاحب سے ٹورنٹو میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ابھی ایک پروگرام سے آرہا ہوں' جہاں درسِ قرآن میں سامعین کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔ اس زمانے میں ٹورنٹو میں درسِ قرآن کے لیے اتنے لوگوں کا جمع ہو جانا بڑی کامیابی تھی۔

خاندان اور جانشین

ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی جناب اظہار احمد مرحوم سے راقم الحروف کے بہت قریبی ذاتی تعلقات تھے۔ وہ بھی کچھ عرصہ ڈاکٹر صاحب کے ہمنوا رہے مگر زندگی کے آخری سالوں میں ڈاکٹر صاحب کے تصور اور کام کے بارے میں مرحوم کئی تحفظات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ البتہ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ بعض امور میں ذاتی اختلاف کے باوجود وہ ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ بطور برادرِ اصغر محبت سے اور بطور معلّمِ قرآن انتہائی احترام سے کیا کرتے تھے۔ مرحوم خود بھی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے باقی برادران جناب اقتدار احمد مرحوم' جناب وقار احمد اور ڈاکٹر ابصار احمد بھی علمی اور تحریکی سوچ کے حامل اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہمنوا اور ممد و معاون تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی بے انتہا خوبیوں میں سے ایک یادگار بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان سے تمام جاہلی رسوم کا خاتمہ کر دیا تھا۔ آج کے دور میں یہ بہت بڑا جہاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا طرزِ بود و باش سادہ اور اسلامی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے بیٹے حافظ عاکف سعید ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں تنظیم اسلامی کے امیر مقرر ہو گئے اور ان کے مشن کو بڑی پامردی سے لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمت اور صلاحیت سے نوازے کہ وہ اس قافلۂ خیر کی قیادت کا حق ادا کر سکیں۔ ان کا خطبۂ جمعہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں خاصا مقبول ہو گیا تھا۔ ان کی طبیعت میں خاصا ٹھہراؤ' تواضع اور ثبات ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے لیے بلندیٔ درجات اور ان کے خاندانی و تنظیمی لواحقین کے لیے صبر و اجر کی دعا ہے۔ oo

احساسات

پروفیسر ڈاکٹر تسنیم احمد ☆

آنکھوں کو اجازت ہے کہ آنسو بہالیں

ڈاکٹر اسرار احمد اس دنیا کے پار اُس جہان میں چلے گئے جہاں جانے کی تیاری میں وہ ایک مدّتِ مدید سے لگے ہوئے تھے..... اور اُس جہان کو جا کر تو پھر کوئی واپس نہیں آیا' چنانچہ اب غلبۂ دین کے اُس جوش سے بھرپور درسِ قرآن کی آواز کبھی نہیں سنی جا سکے گی جو جوش اور ولولہ انہی کا خاصہ تھا۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی جان کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنی جان لگا دی' وہ ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ کی زندہ تمثیل تھے۔ دُعا بھی اور اُمید بھی ہے کہ فرشتوں نے ان کا پُرتپاک استقبال کیا ہوگا اور وہ اللہ کی رحمت اور مغفرت کے سائے میں صدیقین' صالحین اور شہداء کے ساتھ ہوں گے۔

انہوں نے تختہ تختہ جوڑ کر اپنی کشتی بنائی' وہ غلبۂ دین کی فوج کے ایک دستے کے سپہ سالار تھے اور اُن کے جانشینوں میں حق کے سپاہیوں کی ایک باصلاحیت ٹیم ہے جو ان کے مشن کو جاری رکھے گی (ان شاء اللہ) انہوں نے پوری تن دہی سے لوگوں کو اللہ کے حضور حاضر ہونے کے لیے تیار کیا۔ اس پُرآشوب سمندر میں جب ہر چہار جانب طوفان' بلائیں اور گھٹائیں ہیں' باطل پر حملہ آور یہ جھکولے کھاتی ناتواں کشتیوں میں سے ایک کشتی اپنے ناخدا سے محروم ہوئی' لیکن اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں ہماری جانیں ہیں یہ عَلم اٹھا رہے گا' اور باطل سے مقابل کشتیوں کے بادباں یوں ہی تنے رہیں گے! (ان شاء اللہ)

باطل بالیقین دیکھے گا کہ اس کشتی کی رفتار میں نہ کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی باطل کو جب تک وہ غرقاب نہیں ہوتا کوئی جائے اماں ملے گی۔ ہم بلاشبہ اُن کی معیت سے محروم ہو گئے مگر یہ فراق عارضی ہے' جس جدوجہد میں وہ لگے ہوئے تھے اور اقامتِ دین و غلبۂ دین کے سپاہی

☆ مدیر مسئول پندرہ روزہ نشور کراچی

جابجا مصروف ہیں اُس میں اِس جہان سے انتقال نہ کوئی بڑا واقعہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی بڑا حادثہ! یہاں بھی اُسی ایک مالک کے لیے جیتے ہیں اور وہاں بھی اُسی کے حکم پر کشاں کشاں چلے جاتے ہیں اور کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جس کی راہ میں زندگی گزاری ہوتی ہے جب اُس محبوب کے پاس واپسی ہوتی ہے تو: ''جو حق کی خاطر جیتے ہیں وہ مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر..... دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں جب وقتِ شہادت آتا ہے''۔ تاہم کمزور انسان ہونے کے ناتے ہم اپنے ایک رفیق کی عارضی اور بہت مختصر سی جدائی پر کہ جدائی تو جدائی ہے' کچھ دیر کے لیے ٹھٹک کر رُک جاتے ہیں' آنکھوں کو اجازت ہے کہ آنسو بہالیں مگر زبان کو زیبا نہیں کہ ناشکری یا بے صبری کا کوئی کلمہ ادا کرے' بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ صبر کا ترانہ گنگناتی رہے: ﴿قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (البقرہ)۔

ڈاکٹر صاحب کا اصل کارنامہ

ڈاکٹر صاحب اپنی اوائل جوانی ہی میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر سے متاثر ہوئے' اقامتِ دین اور اظہارِ دین ﴿..... لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کی جدوجہد کو اجتماعی زندگی کے ساتھ ادا کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور یہی کام پوری توانائی کے ساتھ کرتے ہوئے جان' جانِ آفریں کے سپرد کی۔ اس کام کو انجام دینے کے دوران انہوں نے اپنی صلاحیتوں' وسائل' اولاد' احساسات اور جذبات میں سے بچا کر کسی اور دنیوی کام کے لیے کچھ نہیں رکھا اور اس عمل میں اللہ کے علاوہ کسی کا خوف ان کو دامن گیر نہیں ہوا۔ جب بھی ان کی کارکردگی کا مؤرخ جائزہ لے گا تو یہی امر سرِفہرست ہوگا۔ راقم کو مختصر سے مواقع پر ان سے ربط کا موقع رہا اور بے شمار تحریکی معاملات میں رائے اور اپروچ کے شدید اختلافات کے باوجود میں یہی گواہی دیتا ہوں۔ اقامت اور اظہار کے لیے کام کرنے والی لیڈرشپ کی یہ پوری موجودہ نسل اور ایک نسل جو گزر گئی ایسی مثال پیش کرنے سے اگر قاصر نہیں تو کم ہی پیش کر سکتی ہے۔ اس معاملے میں وہ آج رہ جانے والوں کے لیے آئیڈیل اور گزر جانے والوں میں ممتاز ہیں۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

ڈاکٹر اسرار احمد دورِ حاضر میں سید مودودیؒ کی اٹھائی ہوئی تحریک غلبہ دین کے گل سرسبد تھے' مستقل مزاج' یکسو' بلا لومۃ لائم اپنی سمجھ کے مطابق حق کو حق کہنے اور باطل کو باطل کہنے سے

نہ ڈرنے والے۔ ان کی تندی باطل کے لیے جہاں قیامت بنتی رہی وہیں وہ حلقۂ یاراں میں بھی بسا اوقات گرمی گفتار کے مرحلوں سے آگے نکلتی اور آزمائش بن جاتی' جمعیت ہو یا جماعت ہر جگہ شیرِ ببر بن کر جیے۔ بسا اوقات خیال آتا ہے کہ اکابرین میں اے کاش صاحبِ تفہیم القرآن اور صاحبِ تدبر قرآن اگر ایک ہی کشتی کے سوار رہتے اور اسی طرح اُن کے خوشہ چینوں میں اسرار اور خرم ایک ہی محاذ پر اپنی توانائیاں لگاتے تو حق کا قافلہ شاید قوی تر ہوتا' مگر مشیتِ ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ امین احسن اصلاحیؒ ایک ایسی نادرِ روزگار تفسیر چھوڑ گئے جو اب صدیوں طالبانِ قرآن کے لیے مشعلِ راہ رہے گی' شاید بہت زیادہ جماعتی مصروفیات انہیں اس کا موقع نہ دیتیں۔ اسی طرح خرم صاحب کے ایک مسلم معاشرے میں عوامی تحریک کے ذریعہ غلبۂ دین برپا کرنے کے لیے نئے تجربات' جن کے نتائج اور حاصلات بلاشبہ چاہے کسی کو پسند ہوں یا ناپسند مگر دورِ حاضر میں غلبۂ دین کی تحریکات کے تجرباتی ڈاٹا اور تجزیاتی علم کا ایک سرمایہ ہیں..... اور دوسری جانب اسرار صاحب کی درس ہائے قرآن کی ایک ایسی عظیم تحریک ہے جو جدید تعلیم یافتہ افراد کے ایک انبوہِ کثیر کو قرآن کے مفاہیم و معانی اقامتِ دین اور غلبۂ دین کے تصور کے ساتھ سمجھا رہی ہے..... یہ دونوں کام شاید دونوں شخصیات ایک جگہ رہ کر نہ کر پاتیں اور توانائیاں خواہ مخواہ ضائع ہوتیں۔

اب سید مودودیؒ اور امین احسن اصلاحیؒ کے ہم راہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور خرم جاہ مرادؒ سب ہی اس بڑی بارگاہ میں چلے گئے جو بہت ہی قدردان اور معاف کرنے والی ہے' اُمید ہے کہ اُس کی رحمت سب کو اپنی عافیت میں لے لے گی' ساری کدورتیں ختم اور جنتوں میں ہمیشگی کی بادشاہت کا آغاز ہوگا..... کاش کہ ہم سب' سارے اگلے اور پچھلے ان آیاتِ الٰہی کی تفسیر ہوں ..... ﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر) ''اہل ایمان کا تو وطیرہ ہی یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ' اے ہمارے رب تو بڑا مہربان اور رحیم ہے''۔

❁❁❁

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت، فکر اور تحریک

پروفیسر نثار احمد ملک، چکوال ☆

حضرت ڈاکٹر اسرار احمدؒ ۱۳ اور ۱۴ اپریل کی درمیانی شب عالمِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف مراجعت فرما گئے۔ ان کا سانحۂ ارتحال اُمتِ مسلمہ کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دین کی خدمت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ ان کی دینی، ملی اور قرآنی خدمات اتنی گراں قدر ہیں کہ تاریخ دعوت و عزیمت انہیں نظر انداز نہ کر سکے گی، بلکہ اپنے دامن میں سنہری حروف سے ان کا ذکر کرے گی۔

ان سطور کے راقم کو ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے اور طویل عرصہ تک ان کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ میں اپنی اس تحریر میں ان کی تحریک اور شخصیت کے حوالے سے اپنے تأثرات بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی دینی، علمی اور تحریکی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں۔ انہوں نے شعوری طور پر ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ'' کو اپنی زندگی کا مقصد اور رضائے الٰہی کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ اپنے نصب العین کے شعور اور یقین کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کی تحریک کے کئی عنوانات تھے۔ اس کا نقطۂ آغاز ''دعوت اِلی اللہ'' تھا، فکری مواد ''تمسک بالقرآن'' کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا اور نظامِ خلافت کا قیام اس کی آخری منزل تھی۔ کبھی وہ اسے ''حکومتِ الٰہیہ'' کے قیام سے موسوم کرتے اور کبھی ''اقامتِ دین'' کی جامع اصطلاح استعمال کرتے تھے۔

ان کے فکری سفر سے ان کے وابستگان خوب واقف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ داستان اپنی کتاب ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'' میں تفصیل سے بیان کر دی ہے۔ وہ

☆ سابق نائب مدیر ہفت روزہ ندائے خلافت

اپنے سکول کے زمانے میں، تقسیم ہند سے پہلے علامہ اقبال کی ملی شاعری سے متاثر تھے اور بعد ازاں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لٹریچر سے دین کے حرکی، جامع اور زندہ تصور کا ادراک حاصل کیا، پھر یہی شعور آپ کو سید مودودیؒ اور ان کی تحریک کے قریب لے آیا۔ چنانچہ پہلے آپ ''اسلامی جمعیت طلبہ'' سے وابستہ ہوئے اور پاکستان میں اس کے قافلہ سالار بن گئے۔ جب طالب علمی کا دور ختم ہوا تو آپ نے ''جماعت اسلامی'' میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔ ایک وقت ایسا آیا جب ڈاکٹر صاحبؒ نے محسوس کیا کہ ''جماعت اسلامی'' اپنے اصولی انقلابی تصور سے پہلوتہی کرتے ہوئے محض ایک اسلامی سیاسی جماعت کے قالب میں ڈھل گئی ہے تو آپ نے چند اکابر کے ساتھ جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والوں میں سے کچھ تو محض علمی کاموں سے وابستہ ہو گئے جبکہ کچھ ایسے بھی تھے جو اس فکر کو مکمل طور پر تج کر یا تو سیکولر سیاست کی وادیوں میں گم ہو گئے یا پھر دنیا کے دوسرے جھمیلوں میں الجھ کر رہ گئے، لیکن ڈاکٹر صاحب ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کی عملی سعی میں لگ گئے۔ زندگی کے آخری لمحے تک اپنی تمام علمی، تحریری اور تقریری صلاحیتیں، اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی تمام توانائیاں اسی مقصد کے لیے صَرف کیے رکھیں۔ آپ نے ایک فرد کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا تھا، مخلص رفقاء ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ذہانت و فطانت کے اعتبار سے ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے، ان کی فکر انتہائی پختہ اور واضح تھی اور ان کا تصورِ دین دلائل و براہین پر مبنی تھا۔ وہ لوگوں کو اس فکر کی طرف جذباتی انداز میں نہیں بلاتے تھے بلکہ پورے شعور اور دلائل کی طاقت سے قائل کرتے تھے۔ ایک طرف وہ قرآن کے معلّم تھے تو دوسری طرف آپ عمرانی مسائل، اُمت مسلمہ کے زوال، اور اس زوال کو عروج میں کیسے بدلا جائے، جیسے موضوعات پر واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنے خطباتِ جمعہ میں سیاسی مسائل پر کھل کر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ ان کے رفقاء میں سے بھی بعض ان کے سیاسی تجزیوں سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کا موقف دل کو لگتا تھا۔ وہ محض ایک واعظ نہ تھے بلکہ اُمتِ مسلمہ کے مسائل کے نباض بھی تھے۔ وہ اُمتِ مسلمہ کے عالمی سطح کے مسائل سے لاتعلق نہیں رہتے تھے۔ اُن کی اسی جامعیت کی وجہ سے ان کے خطباتِ جمعہ سننے والوں میں اکثر تعلیم یافتہ طبقات کے نمائندہ افراد ہوتے تھے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت کا سب سے متاثر کن پہلو آپ کا ''اخلاص فی الدّین'' تھا۔ وہ

اپنے نصب العین کے ساتھ انتہائی مخلص تھے' ان کی مساعی جمیلہ حصولِ رضائے الٰہی کے لیے وقف تھیں' انہوں نے اپنی دینی خدمات کے عوض کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں کیا' ان کی ذات سستی شہرت اور نمود و نمائش سے یکسر پاک تھی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے تمام جائز ذرائع استعمال کیے' چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے درسِ قرآن سے اپنے کام کا آغاز کیا اور بڑے بڑے اجتماعات سے بھی مخاطب ہوئے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلبہ کی قلیل تعداد کو بھی درسِ قرآن دیے اور دنیا بھر کے سفر بھی کیے۔ ان کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ سننے والے کم ہیں یا زیادہ' وہ انتہائی دلسوزی کے ساتھ ''دعوت الی اللہ'' کا فریضہ سرانجام دیتے تھے' یہی وجہ ہے کہ ان کی گفتگو دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ وہ دین کا کام احساسِ ذمہ داری سے کرتے تھے۔ ان کے اس اخلاص فی الدین کے ان کے کٹر مخالف بھی معترف تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو حصولِ دنیا کا ذریعہ نہیں بنایا' چنانچہ آپ کی بہت سی کتب ہیں لیکن انہوں نے اپنی کتب' کیسٹ اور سی ڈیز کی رائلٹی کبھی نہیں لی' کبھی ایک پیسے کا مالی فائدہ نہیں اٹھایا' تمام رسائل و جرائد اور کتب و کیسٹ کی آمدن ''انجمن خدام القرآن'' اور ''تنظیم اسلامی'' کے کاموں پر صَرف ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ ان کی شخصیت بناوٹ و تصنع سے پاک تھی۔ انہوں نے کبھی اپنے گرد کوئی مصنوعی تقدس کا ہالہ قائم نہیں کیا' نہ ہی وہ خود کو کوئی بہت بڑی روحانی شخصیت سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے کام کی بنیاد خوابوں اور غیبی اشاروں پر نہیں بلکہ قرآن و سنت کے روشن دلائل پر رکھی۔ ان کے رفقاء کو ان سے گلہ رہتا تھا کہ ان کے مزاج میں سختی بہت ہے' لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کہتے تھے: ''میں جیسا ہوں آپ کے سامنے ہوں' مجھے میری خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرو''۔ وہ اپنی وضع قطع اور لباس میں انتہائی سادہ انسان تھے۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ لمبے چوڑے سابقے و لاحقے لگانا کبھی پسند نہیں کیا' نہ کبھی اپنے آپ کو ''علامہ'' لکھا' نہ ''مفکرِ اسلام'' اور نہ ''شیخ الاسلام''۔ توبہ توبہ..... وہ تو مولانا بھی نہ لکھتے تھے۔ مجھے اس ضمن میں ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک جلسۂ عام منعقد کرنا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کا کلیدی خطاب تھا' اس کی تشہیر کے لیے جو پمفلٹ شائع ہوا اس میں ڈاکٹر صاحبؒ کے نام سے پہلے ''مفکرِ اسلام'' اور ''مفسرِ قرآن'' لکھا گیا۔ یہ ہینڈ بل ڈاکٹر صاحب

نے دیکھ لیا اور بہت ناراض ہوئے۔ منتظمین کو بلا کر سرزنش کی کہ یہ پمفلٹ کس نے شائع کرایا ہے؟ کہنے لگے میں نے کبھی دعویٰ کیا ہے کہ میں مفسر قرآن ہوں؟ میں تو فقط ''خادمِ قرآن'' ہوں۔ وہ صرف ''ڈاکٹر صاحب'' تھے اور اپنے رفقاء کے لیے ''امیر محترم'' اور امارت سے سبکدوشی کے بعد ''بانیٔ محترم''.....اور بس! ان کی ساری کرامت اور بزرگی یہی تھی کہ انہوں نے پوری زندگی قرآنی علوم کی اشاعت' اقامتِ دین کی جدّوجہد اور تحریک اسلامی کی تنظیم میں کھپادی۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قرآن اکیڈمی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں گزار دیا۔ جس طرح دوسرے ملازمین کے پاس مکانات تھے ویسا ہی ایک مکان ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی تھا۔ ان کی زندگی کروفر اور ہٹو بچو سے پاک تھی اور وہ حقیقی معنوں میں ایک درویش صفت انسان تھے۔ انہوں نے اپنے مالی معاملات اپنی کتاب ''حسابِ کم و بیش'' میں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں کہ کس طرح انہوں نے اللہ پر توکّل کرتے ہوئے میڈیکل پریکٹس کو خیرباد کہہ دیا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو اپنے کام سے عشق تھا اور وہ کبھی اس کام میں تھکتے نہ تھے۔ کسی زمانے میں معروف صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی نے ڈاکٹر صاحب کو ''عاشقِ قرآن'' لکھا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے سینکڑوں دروسِ قرآن سنے ہیں۔ کم از کم تین بار رمضان المبارک میں نماز تراویح کی روح پرور ساعتوں میں دورۂ ترجمۂ قرآن میں شریک ہونے کی سعادت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ تربیتی ورکشاپ اور فکری ریفریشر کورسز میں شریک رہا ہوں۔ ایسا بھی ہوا کہ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے ساتھ آٹھ آٹھ گھنٹے کے پروگرام بھی ہوئے' لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے ابتداءً تروتازہ تھے ویسے ہی آخری لمحے تک! یہ ان کا قرآن سے عشق تھا۔ فقط یہی نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب خود پوری طرح ڈوب کر درسِ قرآن دیتے تھے' بلکہ وہ اپنے ساتھ سامعین کو بھی پوری طرح محو رکھتے تھے' وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا اور ان کا سامع ایک لمحے کے لیے بھی اپنی توجہ ان سے نہیں ہٹا پاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو فصاحت و بلاغت کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا تھا۔ وہ جس موضوع پر لب کشائی کرتے تھے اس کا حق ادا کر دیتے تھے۔ موضوع کا صغریٰ کبریٰ اس قدر مربوط ہوتا کہ ہر لمحے موضوع نکھرتا چلا جاتا۔ کوئی بات موضوع سے عدم مطابقت نہ رکھتی

تھی۔ موضوع کے تمام پہلوؤں کا کمال ربط سے احاطہ کرتے چلے جاتے۔ آیات اور احادیث کے برمحل حوالے اور علامہ اقبال کے اشعار نگینوں کی طرح جڑے ہوتے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بلا کا حافظہ دیا تھا۔ وہ موضوع سے متعلق کوئی بات جو بیان کرنا ضروری ہو' بھولتے نہ تھے۔ آواز کی گھن گرج اور سوز و گداز دل میں اتر جاتے۔ سامع کو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ تین گھنٹے گزر گئے! خطیبِ عصر کا کمال یہ تھا کہ جب خطبہ مکمل ہوتا تو سامع پیغام کو پوری طرح جذب کر چکا ہوتا' اپنے فرائض دینی کے حوالے سے سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اسے بے چین کر دیتا' احساسِ ذمہ داری کی بیش بہا دولت سے مالا مال ہوتا' دین کے عملی تقاضوں کا آغاز اپنی ذات سے کرنے کا فیصلہ کرتا' دین کے عملی تقاضوں سے پہلوتہی کی کسک محسوس کرتا اور تلافی کے منصوبے بھی بناتا۔ یہی ڈاکٹر صاحب کی خطابت کا کمال تھا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!

یہاں میں اپنا ایک ذاتی تأثر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے جتنے بھی خطاب سنے ہیں' ان میں سے ہر ایک کے دوران کوئی نہ کوئی لمحہ ایسا ضرور آیا کہ میری آنکھیں بھر آئیں۔ ع ''دل سے جو بات نکلتی ہے' اثر رکھتی ہے!''

ڈاکٹر صاحب ''فنافی القرآن'' تھے۔ انہوں نے نصف صدی قرآن حکیم کے علوم و معارف کو سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کی' لیکن قرآن کی عظمت ان کے دل و دماغ پر یوں نقش تھی کہ کبھی بغیر تیاری کے درس قرآن نہیں دیا۔ کبھی اس احساس میں مبتلا نہیں ہوئے کہ انہیں قرآن پر عبور ہے۔ اس کے برعکس وہ کہا کرتے تھے کہ قرآن پر کسی کو عبور حاصل نہیں ہو سکتا☆۔ ہر

☆ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک مشہور عالم دین نے یہ کہہ دیا کہ ''ان کو قرآن پر عبور حاصل ہے''۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں پیغام بھجوایا کہ آپ نے یہ کہہ کر قرآن کی توہین کی ہے' کیونکہ قرآن پر عبور حاصل کرنے کا مطلب ہے قرآن کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلے جانا' حالانکہ قرآن تو ایک بحرِ بے کنار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کے بعض غامض نکات ایسے ہیں جن تک کوئی بھی رسائی حاصل نہ کر سکا۔ امام رازیؒ جیسا شخص بھی سورۃ الحدید کی آیت ۳ کے الفاظ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ پر دہشت زدہ ہو کر کہتا ہے: ''ہوشیار ہو جاؤ' یہ مقام بڑا غامض ہے' عمیق ہے' مہیب ہے!'' الغرض کسی شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ اسے قرآن پر عبور حاصل ہے یہ قرآن کی توہین کے مترادف ہے۔ (ادارہ)

بار تدبر کرنے سے نئے نکات کھلتے ہیں۔ ازروئے حدیث نبویؐ ''اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے''۔ یہ جواہرات کی ایسی کان نہیں ہے جہاں سے سارے ہیرے ایک ہی بار نکال لیے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب درسِ قرآن سے پہلے باقاعدہ تیاری کرتے' نوٹس لیتے اور نکات کو مرتب کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کی فصاحت و بلاغت اور خطیبانہ فضیلت کے حوالے سے میرا ایک تاثر یہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو ملکہ تحریر کے حوالے سے عطا کیا تھا (جس طرح وہ انتہائی آسان زبان میں فلسفہ و فکر کے بڑے بڑے موضوعات بیان کرتے تھے) بالکل ویسے ہی خطابت کے میدان میں ڈاکٹر صاحب کو یہ ملکہ عطا کیا تھا۔ مولانا مودودیؒ کے زمانہ میں ذرائع ابلاغ اتنے ترقی یافتہ نہ تھے جبکہ ڈاکٹر صاحب جس عہد میں کام کر رہے تھے اس میں میڈیا انسان کے اعصاب پر پوری طرح سوار تھا' چنانچہ ڈاکٹر صاحبؒ نے میڈیا پر اپنی فصاحت و بلاغت کے وہ جوہر دکھائے کہ لادین طبقہ کو پریشان کر دیا' جبکہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کثیر تعداد کو متاثر کیا۔

ڈاکٹر صاحب اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے تھے اور ''ایمانِ حقیقی'' کو اصل قوت اور جذبۂ محرکہ سمجھتے تھے۔ ''ایمانِ حقیقی'' کا حصول قرآن کے بغیر ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو علومِ قرآنی کے حصول کی طرف راغب کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے عملی اقدامات اٹھائے گئے۔ ''انجمن ہائے خدام القرآن'' کے زیر انتظام کم و بیش تمام بڑے شہروں میں ''قرآن اکیڈمیاں'' قائم کی گئیں۔ اولاً قرآن اکیڈمی لاہور میں دو سالہ اور ایک سالہ ''رجوع الی القرآن'' کورسز کا اجراء کیا۔ ان کورسز میں ایسے نوجوانوں کو داخلہ دیا جاتا جو جدید تعلیم سے آراستہ ہوتے۔ چنانچہ بڑی تعداد میں ڈاکٹر' انجینئر' ایم اے' ایم ایس سی حضرات ان کورسز سے مستفید ہوئے۔ اس طرز کے کورسز بعد میں تمام قرآن اکیڈمیوں میں جاری کیے گئے۔ اس ضمن میں لاہور میں قرآن کالج کا قیام بھی ایک اہم سنگ میل ہے۔ اب تک سینکڑوں نوجوان ڈاکٹر صاحب کے طرز پر ''دروسِ قرآن'' کے حلقے قائم کیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی کتاب ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'' میں اپنے قرآنی خدمات کے سفر کی تفاصیل بیان کی ہیں' لیکن یہ کتاب ڈاکٹر صاحبؒ کی خدمات کا مکمل احاطہ نہیں کرتی۔ یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی' جبکہ اس کی

اشاعت کے بیس سال بعد کی مساعی جمیلہ کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ تفسیر قرآن اور تصورِ دین کے حوالے سے ایک طرف اسلاف سے مکمل طور پر جڑے ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف عصر جدید کے تقاضوں سے بھی کما حقہٗ آگاہ تھے۔ نہ وہ اپنے اسلاف سے لاتعلق تھے اور نہ ہی جدیدیت سے مرعوب۔ اس کے برعکس انہوں نے نہ تو جدید تقاضوں سے صرفِ نظر کیا اور نہ ہی اپنے اسلاف کے نقطۂ نظر کو مسترد کیا۔ وہ توازن اور اعتدال کی راہ پر گامزن تھے۔

ڈاکٹر صاحبؒ جس عہد میں کام کر رہے تھے وہ ذرائع ابلاغ کے تسلط کا دور تھا' لہٰذا ان کے راستے میں جو بڑی بڑی رکاوٹیں تھیں ان میں سے ایک رکاوٹ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر چھائے ہوئے سیکولر دانشور تھے جو کسی ایسی توانا آواز کو ابھرنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے ڈاکٹر صاحبؒ کا راستہ روکا گیا۔ بعض دفعہ ایسے بھی ہوا کہ جان بوجھ کر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی گئی اور ڈاکٹر صاحب کی آراء کو توڑ مروڑ کر شرانگیزی پھیلائی گئی' ڈاکٹر صاحبؒ کے ٹی وی پروگرام بند کرائے گئے' لیکن اگر ایک راستہ بند ہوا تو اللہ تعالیٰ نے کوئی دوسرا راستہ کھول دیا۔ بقول شاعر ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے' اُدھر نکلے' اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

ڈاکٹر صاحبؒ کے راستے کی دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ وہ نہ تو خود کسی خاص مسلک کے پرچارک تھے اور نہ ہی فقہی اعتبار سے وہ اپنے رفقاء کو کسی خاص فقہی مسلک سے وابستہ رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ بعض فروعی اختلافات پر مبنی مسالک میں سے کسی کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ ان کا تصورِ دین فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مخصوص فرقہ وارانہ ذہن آپ کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ ڈاکٹر صاحب شرک و بدعت کے سخت خلاف اور توحید و سنت کے داعی تھے' لیکن انہوں نے ان موضوعات کو کسی مخصوص فرقے کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کبھی بیان نہیں کیا' وہ مثبت انداز میں کلامی مسائل بیان کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی عظمت کا ایک پہلو ان کی حق گوئی اور بے باکی تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے' ان کا جو بھی موقف ہوتا اسے ڈنکے کی چوٹ بیان کرتے تھے۔ یہ موقف کسی علمی نکتہ کے حوالے سے ہو یا قومی اور سیاسی موضوعات سے متعلق ہو' ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات بغیر کسی

مصلحت کے بیان کی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ کسی علمی مجلس میں وہ اپنے موقف کے حوالے سے تنہا رہ جاتے۔ اس حق گوئی کے حوالے سے بعض دفعہ ان کی جان کو فی الواقع خطرات لاحق ہو گئے لیکن انہوں نے اپنی بات اگر تبدیل کی ہے تو دلائل کی روشنی میں' کسی مصلحت کے تحت نہیں۔ وہ صاف اور کھری بات حکمرانوں کے منہ پر کرتے تھے۔ مرحوم ضیاء الحق سے جب بھی سامنا ہوا کھری کھری سنا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حکمرانوں کے حلقۂ مشاورت میں کوئی خاص جگہ نہیں پاتے تھے۔

محترم ڈاکٹر صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل یہ تھا کہ ان کے خاندان کے کم و بیش تمام افراد ان کے دست و بازو تھے۔ عہدِ حاضر میں یہ بہت بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بھائی اقتدار احمد مرحوم' بانی مدیر ہفت روزہ ''ندا'' اور ''ندائے خلافت'' آپ کے ساتھ ہمہ تن مصروفِ عمل رہے۔ ان کے قلم میں بلا کی تیزی اور کاٹ تھی۔ انہوں نے اس صلاحیت کو ڈاکٹر صاحب کی تحریک کے لیے وقف کیے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال و دولت سے نوازا تھا' چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس عطا کو بھی دین کے لیے خوب لٹایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اقتدار احمد کی مثال میرے کام میں نصرت کے حوالے سے ایسی ہی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی پروفیسر ڈاکٹر ابصار احمد بھی آپ کے علمی کاموں کو آگے بڑھانے میں گراں قدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کتب کے انگریزی تراجم ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ''حکمت قرآن'' کے اعزازی مدیر بھی ہیں☆۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے چاروں بیٹے اور پانچوں بیٹیاں اور تمام داماد ''تنظیم اسلامی'' اور ''انجمن خدام القرآن'' سے عملی طور پر وابستہ ہیں۔ محترم حافظ عاکف سعید صاحب تو ڈاکٹر صاحبؒ کے جانشین ہیں۔ ان سے ڈاکٹر صاحبؒ کے وابستگان کو بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے مشن کو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں میں ڈاکٹر صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے عزیزم آصف حمید کی خدمات کا ذکر ضرور کروں گا۔ آصف حمید صاحب ''انجمن خدام القرآن'' کے شعبہ سمع و بصر کے

☆ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے انتقال کے بعد مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس شوریٰ نے متفقہ طور پر ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کا بطور صدر انجمن انتخاب کر لیا ہے۔ (ادارہ)

انچارج ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کام میں انہوں نے خوب مہارت حاصل کر لی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے دروس وخطابات کی اعلیٰ درجے کی ریکارڈنگ سے لے کر سی ڈیز اور کیسٹس کی شکل میں جدید آڈیو ویڈیو معاونات کی مدد سے تیاری' ایڈیٹنگ اور ترسیل واشاعت کے کام کا سہرا آصف حمید صاحب کے سر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے جو دروس وخطابات آن ایئر جاتے ہیں وہ آصف حمید صاحب کے دستِ ہنر سے گزر کر جاتے ہیں اور انہی کی مہارت کا کرشمہ ہیں۔ تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ پر بانیٔ تنظیم اور امیر تنظیم کے دروس وخطابات اور کتب ورسائل کی دستیابی بھی آصف حمید صاحب کے شعبہ کی ذمہ داری ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی عظمت کے بے شمار پہلو ہیں جن کا احاطہ اس مختصر تحریر میں ناممکن ہے۔ تمام تر عظمتوں کے باوجود وہ معصوم عن الخطا ہرگز نہ تھے۔ وہ ایک انسان تھے' ان سے بشری تقاضوں کے تحت یقیناً کوتاہیاں اور لغزشیں بھی سرزد ہوئی ہوں گی۔ ہم اللہ رحیم وکریم کی بارگاہ میں ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہیں اور مغفرت کے خواستگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ ان کی خدماتِ جمیلہ کو شرفِ قبول عطا فرماتے ہوئے ان سے عفو ودرگزر کا معاملہ فرمائے۔ آمین!

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 15 روپے

موت العالم موت العالم

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر میاں محمد اکرم ☆

آب پارہ اور لال مسجد کے قریب اسلام آباد کمیونٹی سنٹر میں ان کے درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ انٹرنیشنل اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد اس درس کے آغاز کی خبر پہنچی تو نوجوانوں میں اس کے حوالے سے بہت جوش وجذبہ تھا۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس درس قرآن کے لیے کھنچی چلی آئی تھی۔ اسلامی جمعیت طلبہ وتحریک اسلامی سے وابستہ لوگ اس درس میں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور کمیونٹی سنٹر کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ پی ٹی وی پر الہدیٰ اور ''میثاق'' سے یہ تعلق مزید بڑھا۔ بڑے بھائی میاں محمد انور مرحوم نے جب اظہار گروپ میں ملازمت اختیار کی اور ان سے ملنے اُن کے آفس واقع ریواز گارڈن لاہور جانا ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی محترم وقار احمد سے ملاقات ہوئی۔ یوں یہ ملاقات بعد میں رشتہ داری میں بدل گئی اور مئی ۱۹۸۹ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے میرا نکاح مسجد دارالسلام باغ جناح میں پڑھایا۔ اس رشتہ داری کے بعد ڈاکٹر صاحب اور ان کے خاندان سے ایک مسلسل رابطہ پیدا ہوا۔ راقم نے اس خاندان کو بنیادی طور پر دین کے ساتھ والہانہ لگاؤ' دین کی سربلندی کے لیے کوشش اور قرآن سے وابستگی رکھنے والا پایا۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے خاندان میں بڑی تبدیلی آئی۔ شادی بیاہ کے معاملات میں ایک باقاعدہ تحریک شروع کی گئی کہ نکاح مسجد میں ہو اور شادی بیاہ کی رسومات کا خاتمہ کیا جائے' جس میں ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے بڑی کامیابی عطا فرمائی۔ اس کے ساتھ اپنے خاندان اور وابستگان میں پردے کے احکام پر عمل کرنے کا داعیہ پیدا کیا جو کہ ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو حصار (مشرقی پنجاب' موجودہ ہریانہ) انڈیا میں پیدا

☆ سیکرٹری جنرل تنظیم اساتذہ پاکستان۔ مدیر اعلیٰ ماہنامہ افکار معلم لاہور

ہوئے' ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی' مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پلیٹ فارم پر تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں حصار سے اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی (پری میڈیکل کا امتحان) نمایاں پوزیشن کے ساتھ پاس کی اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے MBBS کا امتحان ۱۹۵۴ء میں پاس کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی اختیار کر لی' جمعیت میں رہتے ہوئے آپ مختلف ذمہ داریاں نبھاتے رہے حتیٰ کہ ناظم اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز ہوئے' اسی دوران مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے قریبی تعلق قائم ہوا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے اور منٹگمری (ساہیوال) میں جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ اس دوران ساہیوال' اوکاڑہ' پاک پتن' چیچہ وطنی اور عارف والا میں دروسِ قرآن کے پروگرامات کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی جماعت اسلامی کے ساتھ وابستگی تقریباً سوا دو سال کے عرصہ پر محیط ہے جو کہ ۱۹۵۵ء سے لے کر اپریل ۱۹۵۷ء تک برقرار رہی۔ لیکن یہ وابستگی جماعت اسلامی کے انتخابات میں حصہ لینے کی پالیسی سے اختلاف کی بنا پر ختم ہو گئی' چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی' ڈاکٹر اسرار احمد اور دیگر شخصیات نے جماعت اسلامی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ڈاکٹر صاحب پہلی بار ۱۹۵۸ء میں کراچی منتقل ہو گئے' لیکن پھر واپس آ گئے۔ دوسری بار ۱۹۶۲ء میں مشترک خاندانی کاروبار کے سلسلے میں کراچی منتقل ہوئے' لیکن اس دوران قرآن پاک کے دروس کا سلسلہ جاری رہا اور ساتھ ہی تعلیم کا سلسلہ بھی۔ کراچی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب نے مولانا افتخار احمد بلخی سے تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ سبقاً سبقاً پڑھا اور اس کے بعد جامعہ کراچی کے شعبۂ اسلامیات میں داخلہ لے لیا' انہوں نے ۱۹۶۵ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کیا اور جامعہ کراچی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس سال انہوں نے لاہور منتقلی کا فیصلہ کر لیا' اس کا مقصد بقول ڈاکٹر صاحب یہ تھا کہ میں ''غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کے پختہ ارادے اور تعلم و تعلیم قرآن کی منظم منصوبہ بندی کے عزم صمیم کے ساتھ وارد لاہور ہوا' چنانچہ وہ دن اور آج کا دن یہی دو کام میری زندگی کا محور رہے ہیں''۔

لاہور منتقلی کے بعد طب کی پریکٹس بھی جاری رہی اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ لیکن پانچ سال بعد اپنی تمام صلاحیتیں اور اوقات درسِ و تدریس قرآن کے لیے وقف

کر دیے۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ بھی تعلق جاری رہا۔ ان کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کی پہلی جلد ڈاکٹر صاحب نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کروائی۔ ماہنامہ میثاق جناب مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا' لیکن اس کی اشاعت معدوم ہونا شروع ہوگئی۔ اسی دوران ڈاکٹر صاحب نے اپنا جریدہ شروع کرنے کے لیے ڈیکلریشن حاصل کرلیا۔ جب مولانا اصلاحیؒ صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے ماہنامہ ''میثاق'' کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ یوں ماہنامہ ''میثاق'' ڈاکٹر صاحب کی ادارت میں جاری و ساری ہوگیا جو آج تک جاری ہے۔

قرآن پاک کی دعوت عام کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۲ء میں انجمن خدام القرآن کی بنیاد رکھی اور مارچ ۱۹۷۴ء میں انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام سالانہ قرآن کانفرنسز کا آغاز ہوا۔ ان کانفرنسز میں ملک بھر کے نامور علمائے کرام اور سکالرز کی شرکت ہوتی رہی اور مختلف موضوعات پر سیر حاصل بحثیں ہوتی رہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی جس کا مقصود قرآن پاک کی دعوت کو عام کرنا اور نظام خلافت کو قائم کرنا قرار دیا۔ ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور کی تعمیر عمل میں آئی۔ قرآن اکیڈمی میں ۱۹۸۴ء میں دو سالہ کورس کا آغاز کیا گیا جبکہ ۱۹۸۷ء میں قرآن کالج کی بنیاد رکھی گئی۔

ڈاکٹر صاحب کو زیادہ شہرت ان کے پی ٹی وی پر پروگراموں سے حاصل ہوئی۔ آپ مسلسل تین سال تک ماہ رمضان میں ''الکتاب'' اور ''الٓمٓ'' کے عنوان سے پروگرامات کرتے رہے' جب کہ پندرہ ماہ تک ڈاکٹر صاحب ''الہدیٰ'' کے نام سے پی ٹی وی پر ہفتہ وار پروگرام کرتے رہے۔ جب یہ پروگرام نشر ہونا شروع ہوا تو اسے بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوسری طرف الحاد و اباحیت کے علم بردار میدان میں کود پڑے اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ اس کے جواب میں دینی جماعتوں اور ڈاکٹر صاحب کے چاہنے والوں نے جوابی مظاہروں کا اہتمام کیا۔

پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ حیدر آباد دکن (بھارت) میں ڈاکٹر صاحب کے درس قرآن میں ۱۵ ہزار مردوں اور ۵ ہزار خواتین نے شرکت کی۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک کارنامہ دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز ہے' جس میں رات گئے تک نماز تراویح کے دوران ماہ رمضان میں پورے قرآن کا ترجمہ بیان کرتے رہے۔ ساتھ میں ان کے کئی شاگرد اس کام کے علم بردار بن گئے اور مختلف مقامات پر یہ سلسلہ جاری وساری ہوگیا۔ اس کے بعد دیگر لوگوں نے بھی اس سلسلہ کو مختلف مقامات پر جاری کیا۔ یوں ایک اور مبارک تحریک کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے دروس کے کیسٹس اس وقت لاکھوں کی تعداد میں تیار ہوکر ہر خاص وعام تک پہنچ چکے ہیں' جس سے دنیا بھر میں لاکھوں لوگ استفادہ کررہے ہیں۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کی سی ڈی ''بیان القرآن'' کے عنوان سے تیار ہوئی ☆ اور یوں قرآن پاک کی دعوت دور دور تک پہنچانے کا اہتمام ہوا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ اپنی بیماری اور پیرانہ سالی کے باوجود دعوتِ دین اور دعوتِ رجوع الی القرآن کے سلسلہ میں مسلسل کوشاں رہے۔ چند روز پہلے جامعہ پنجاب میں انہوں نے خطاب کیا اور ماہ ربیع الاول میں پانچ اتوار مسلسل سیرت کے پیغام کے حوالے سے قرآن آڈیٹوریم میں پروگرامات جاری رہے۔ اس کے علاوہ ملتان اور دیگر شہروں میں بھی ان پروگرامات کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۳ اور ۱۴ اپریل کی درمیانی رات کو ڈاکٹر صاحب اپنے رب سے جاملے۔ امید ہے ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہوگا جسے قرآن پاک نے یوں بیان کیا ہے:

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾﴾ (الفجر)

☆ محترم ڈاکٹر صاحب کا شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن ''بیان القرآن'' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ جو تعارفِ قرآن' سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ پر مشتمل ہے' شائع ہو چکا ہے' جبکہ اس کا دوسرا حصہ جو سورۂ آل عمران' سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ پر مشتمل ہے' زیرطباعت ہے۔ (ادارہ)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

پیکرِ صدق وصفا

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

۱۹۶۷ء میں میرا قیام اسلامیہ پارک لاہور میں تھا۔ مجھے قرآن فہمی کا شوق تھا۔ لاہور میں جہاں کہیں درسِ قرآن کا پتا چلتا میں وہاں حاضر ہوتا اور پہلی صف میں بیٹھ کر انہماک سے مدرس کی بات سنتا۔ ایک دن اخبار میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن کا اشتہار دیکھا۔ اتوار کے دن درس سننے کے لیے میں سمن آباد کی کوٹھی نمبر ۳۱۱۔ این میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے وقت مقررہ پر درس شروع کیا اور اعلان کے مطابق پابندیٔ وقت کے ساتھ درس ختم کیا۔ مجھے بے انتہا حیرت اور خوشی ہوئی کہ اس انداز کا درس میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں سنا تھا۔ زیر درس آیات کی تشریح کے دوران ڈاکٹر صاحب نے ایک جملہ بھی ایسا نہ بولا جو غیر متعلقہ اور بھرتی کا ہو۔ آیات کی تشریح اس انداز سے کی کہ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' والا معاملہ ہو گیا۔ پھر کیا تھا' میں باقاعدگی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے درس میں حاضر ہوتا۔ کچھ ہی دنوں میں کوٹھی کی جگہ تنگ پڑ گئی اور حاضرین کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ درس کے لیے کسی کشادہ جگہ پر انتظام کرنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب کافی عرصہ تک مسجد خضراء سمن آباد اور مسجد شہداء ریگل چوک میں درس دیتے رہے اور لوگوں میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرتے رہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں تو سالہا سال تک آپ خطابِ جمعہ کی ذمہ داری ادا کرتے رہے' جہاں مسجد کی کشادگی سامعین کی کثرت کے باعث تنگ پڑ جاتی تھی۔

درسِ قرآن کے ذریعے میرا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ قریبی تعلق پیدا ہو گیا۔ ایف سی کالج سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر ریٹائر ہونے کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کے زیر انتظام قرآن اکیڈمی میں کام کرنے لگا جو اب تک جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو انتہائی مدلل اور پُرتاثیر

ہوتی تھی۔ الفاظ کا موزوں انتخاب ان کی تحریر و تقریر کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ کسی خاص مکتب فکر کے نمائندے نہ تھے۔ وہ ''خُذ ما صَفا ودَع ما کدر'' کے قائل تھے' جہاں سے اچھی بات ملتی قبول کر لیتے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ خواہ مخواہ دوسروں پر تنقید نہ کرتے۔ البتہ اگر کسی کا موقف قرآن وسنت سے متصادم ہوتا تو اس کی نشاندہی کرتے۔ وہ اپنے ہم عصر علمائے حق کی قدر کرتے بلکہ اُن سے راہنمائی حاصل کرنے میں بھی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے۔ مولانا حامد میاںؒ (جامعہ مدنیہ لاہور) اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ (کراچی) کے ساتھ ان کا مسلسل رابطہ رہتا۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ درس قرآن کے دوران اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لیے انوکھی باتیں نہ کہتے بلکہ اُن کا سارا زور اس بات پر ہوتا کہ قرآن کریم کی آیات کی تشریح کرتے وقت وہ قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ کو بنیاد بنائیں۔ وہ مشاہیر سلف صالحین کی تفاسیر سے بھی فائدہ اٹھاتے۔ بزرگ علمائے دین کی تعریف وتوصیف میں فراخدلی کا مظاہرہ کرتے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ' شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ذکر تو انتہائی عقیدت کے ساتھ کرتے۔ فقہائے کرام کی خدمات کا اعتراف کرتے اور ان کا نام احترام سے لیتے۔ ان کی تحقیق کی قدر کرتے تھے۔ آپ انبیاء کے علاوہ کسی انسان کو معصوم عن الخطا نہ سمجھتے۔ وہ اپنی بات کو کبھی حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے بلکہ جہاں مضبوط دلائل کے ساتھ اُن سے اختلاف کیا جاتا وہ فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو جاہلانہ تقلید اور ہندووانہ رسم ورواج سے نفرت تھی۔ شادی بیاہ کے ضمن میں فضول رسومات کو ختم کرنے کو انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا آغاز اپنی ذات سے کیا' اپنی بیٹیوں کو جہیز نہیں دیا اور نہ ہی بیٹوں کے سسرالیوں سے جہیز قبول کیا۔ بارات کی صورت میں ایک لشکر لے کر جانا اور لڑکی والوں کے گھر سے دعوت کھانے کو کمینگی اور خسّت جانتے تھے۔ ہاں دعوتِ ولیمہ کو مسنون سمجھ کر اس کا اہتمام کرتے اور شرکت کو ضروری قرار دیتے تھے۔ اسی طرح شادی غمی یا دوسرے موقعوں پر عورتوں مردوں کی مخلوط محافل کو ناجائز قرار دیتے اور کسی ایسی محفل میں شریک نہ ہوتے جہاں عورتوں کے لیے پردے کا اہتمام نہ ہوتا۔ انہوں نے مسجد میں نکاح کا اعلان کر کے بڑے بڑے علماء کو حیرت میں ڈال دیا' کیونکہ معاشرے میں اس پر کہیں عمل نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی بنیاد حدیث اور سنت سے واضح کی تو

لوگوں میں مسجد میں نکاح کرنے کا رواج عام ہوتا گیا۔ آپ شرعی پردے کے سختی سے قائل تھے اور اپنے گھروں میں آپ نے اس کا اہتمام کر رکھا تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے علماء اور صوم وصلوٰۃ کے پابند مسلمان بھی معاشرے میں موجود غیر اسلامی رسومات کو شادی بیاہ اور موت کے موقع پر اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ کمزوری نہ تھی' بلکہ جس چیز کو خلافِ سنت سمجھتے تھے اس کو کبھی اختیار نہ کرتے اور پھر دوسروں کو بھی اس سے روکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب عالم باعمل تھے۔ ان کی زندگی ایک پکے سچے مسلمان کی زندگی تھی۔ وہ آخری دم تک اپنے مشن کے ساتھ مخلص رہے۔ ان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین دین اسلام کی سربلندی اور دنیا میں نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ چنانچہ انہوں نے قرآنی تعلیمات کو عام کرنے اور نفاذِ شریعت اسلامی کے نفاذ کے لیے شبانہ روز محنت کی' اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے لاتعداد سفر کیے۔ جب تک ممکن ہو سکا وہ یورپ اور امریکہ جاتے رہے اور وہاں قرآن وسنت کی تعلیمات کا پرچار کرتے ہوئے وہاں کے مسلمانوں کو صحیح مسلمان بننے کی تلقین کرتے رہے۔

ہر چھوٹا بڑا شخص اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی پیشہ اپناتا ہے۔ اگر وہ اپنے پیشے سے مطمئن ہوتا ہے تو اپنے بچوں اور وابستگان کو وہی پیشہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے' بصورتِ دیگر وہ اپنے بچوں کو اس پیشے سے دور رکھتا ہے۔ ڈاکٹر حضرات عام طور پر اپنے بچوں کو ڈاکٹر بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خود ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے' مگر انہوں نے میڈیکل پروفیشن کو خیرباد کہہ کر قرآن کی خدمت کو اختیار کیا اور اسی پر اپنی زندگی گزار دی۔ دین کی خدمت کے اس کام سے ڈاکٹر صاحب اس قدر مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اسی کام پر لگا دیا۔ چنانچہ ان کے چاروں بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دین کے کام میں پورے خلوص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ یہ ایک بڑا حقیقت نما ٹیسٹ ہے۔ کتنے ہی تنخواہ دار عالمِ دین ہیں کہ جنہوں نے اپنی اولاد کو دین کی خدمت میں نہیں لگایا بلکہ ان کے لیے دوسرے پیشے پسند کیے' حتیٰ کہ اچھی تنخواہ کے لالچ میں انہیں ناجائز کاروبار میں داخل کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے چاروں بیٹے عالمِ دین اور پرہیزگار ہیں اور دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است!

ڈاکٹر صاحب کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ دین کا علم سیکھیں اور دین کی

نشر و اشاعت میں اپنی پوری زندگی وقف کر دیں۔ ایسے لوگوں کی کفالت معاشرے کے ذمے ہے' مگر عوام کے اس فنڈ سے وہ صرف اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں' کوئی جائیداد وغیرہ نہیں بنا سکتے۔ مشکل سے ہی کوئی عالم دین اس معیار پر پورا اتر سکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر صاحب میڈیکل کی تعلیم کے دوران ہی قرآنی تعلیمات پھیلانے میں لگ گئے تھے۔ میڈیکل پروفیشن کے دوران آپ کے حلقہ ہائے دروس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ جلد ہی انہوں نے عہد کر لیا کہ وہ پوری زندگی خدمت دین کے لیے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ وہ ساری زندگی قرآنی تعلیمات عام کرنے اور خدمت دین میں لگے رہے۔ نہ کوئی بینک بیلنس چھوڑا' نہ کوئی جائیداد' اور اسی حال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کی طرف سے آپ کو رہائش کے لیے چھوٹا سا ایک کوارٹر اور علاج معالجے کی سہولت حاصل تھی۔

دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی ہوشربا سانحات سے گزرنا پڑا۔ آپ نے زندگی پھولوں کی سیج پر نہیں گزاری۔ جب آپ نے خدمت دین کی بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا تو تمام رشتہ دار مخالف ہو گئے (اگرچہ بعد میں سب آپ کے اعوان و انصار بن گئے۔) آپ کی ایک بیٹی کو خلع لینا پڑا' ایک داماد سڑک کے حادثے میں وفات پا گیا' ایک پھول سا کمسن پوتا بجلی کا کرنٹ لگنے سے فوت ہو گیا۔ بیماریوں نے آپ کو گھیرے رکھا۔ کونسی بیماری تھی جو آپ کو نہ تھی۔ گھٹنے آپ کے مصنوعی تھے' ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف کی وجہ سے آپریشن ہوا اور اس میں لوہے کی پلیٹیں ڈالی گئیں' شوگر آپ کو تھی' بلڈ پریشر کے آپ مریض تھے' پتے کا آپریشن آپ کا ہو چکا تھا' لیکن ڈاکٹر صاحب مردِ آہن تھے۔ یہ ساری تکلیفیں آپ کے عزم و استقلال کو متزلزل نہ کر سکیں اور آپ اپنے مشن میں اس قدر سرگرم رہے کہ کسی دیکھنے اور سننے والے کو اس بات کا احساس نہ ہوا کہ اس شخص کو اس قدر پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ اُن کی وفات کے بعد لوگ پوچھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بیمار تھے؟ گویا ڈاکٹر صاحب کی اپنے مشن کے ساتھ ایسی وابستگی تھی کہ گھر سے باہر کے سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب صحت مند اور توانا ہیں۔ مگر حال یہ تھا کہ ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

سفر سے کبھی آپ نہیں گھبرائے' بیماری آپ کو آرام کرنے پر مجبور نہ کر سکی۔ کثرت کے ساتھ دوائیاں استعمال کر کے آپ اپنے آپ کو درس و تدریس اور تبلیغ و تعلیم کے لیے ہر وقت تیار پاتے۔ وقت کی پابندی کا یہ حال تھا کہ چند منٹوں کی تقدیم و تاخیر آپ کو گوارا نہ تھی۔ اسی لیے آپ کے پروگراموں میں لوگ قبل از وقت پہنچ جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص قسم کا رُعب و دبدبہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کبھی کسی حکمران یا معروف سیاسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے' بلکہ بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار اور مالکانِ جاہ وجلال آپ کے پاس آتے تھے اور کھری کھری سن کر جاتے تھے۔ کسی کو آپ کے سامنے استدلال کرنے کا یارا نہ ہوتا۔ ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں آپ شامل ہوئے مگر دو ماہ بعد ہی واپس آ گئے کہ جب کوئی مشورہ ماننا نہیں جانا تو فضول وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ جبکہ بہت سوں نے اسے اپنے لیے بڑا اعزاز سمجھا۔ جو بھی بڑا آدمی آپ کے پاس آتا آپ اس کو اسلامی نظام کے نفاذ کی جدّوجُہد میں شامل ہونے کی دعوت دیتے اور کسی سے کسی طرح کی ہمدردی اور تعاون کا مطالبہ نہ کرتے اور نہ کوئی اُمید رکھتے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک صحیح مسلمان کی زندگی تھی جس میں معروف پر عمل اور اس کی تبلیغ تھی' منکرات سے نفرت تھی۔ گویا آپ ﴿وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷) کی سچی تصویر تھے۔ آپ کو اطمینانِ قلب کی بیش بہا دولت میسر تھی۔ اسی کے سہارے آپ اپنے مشن کی تکمیل کے راستے کی ہر رکاوٹ کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹا دیتے تھے۔

۱۴/اپریل ۲۰۱۰ء کی شب طلوعِ سحر سے قبل آپ نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ ایک عالم کو آپ سوگوار چھوڑ گئے۔ آپ کے فراق میں آپ کے عقیدت مند غم واندوہ کی گھاٹیوں میں اتر گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اہل و عیال' عقیدت مندوں' خیر خواہوں اور وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مگر جس دن یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا وہ ڈاکٹر صاحب کے لیے یومِ نجات تھا۔ اس دن آپ کے سارے دکھ درد' غم واندوہ' پریشانیاں اور بیماریاں دور ہو گئیں۔ آپ اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے جس کی رضا کے حصول کی خاطر آپ نے پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اب آپ کی قبر جنت کے باغوں میں سے

ایک باغ ہے۔ آپ غلبۂ دین حق کی کھیتی کی آبیاری کرتے رہے' آپ کی وفات کا دن اس کھیتی کی پیداوار کے حاصل کرنے کا دن ہے۔ جس ربّ کریم کی رضا حاصل کرنے میں آپ نے شبانہ روز محنت کی' آج بقول اقبال رح ''خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے'' کے مصداق آپ کو بے حد وحساب انعامات سے نواز کر خوش کر دیا جائے گا۔

میں نے وفات کے بعد آپ کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو چہرے پر بے بسی اور مردنی کے آثار نہ تھے' بلکہ وہی رُعب و دبدبہ اور جلال نمایاں تھا جو زندگی میں ان کے چہرے پر ہوتا تھا۔ لگ رہا تھا گویا گہری نیند سو رہے ہیں۔ چہرے کی یہ تازگی اور تمتماہٹ ہر دیکھنے والے کو متاثر کر رہی تھی' بقول اقبال ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اللہ تعالیٰ آپ کی لغزشیں اور خطائیں معاف فرمائے اور بلند درجات سے نوازے' آمین۔ رح ''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!''

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 20 روپے

موت العالم موت العالم

وہ مہرباں جو مہر سے محروم کر گیا
محرومیوں میں اس کی صدا کی تلاش ہے

بلقیس قمر سبزواری ☆

دنیا کی قید و بند میں ایسے ہے زندگی　　مدھم سی روشنی میں جلا ہو کوئی چراغ
چھوڑا جو زندگی کو تو آزاد ہو گئے　　اک نقش رہ گیا ہے کہیں فرشِ خاک پر

آفتابِ علم و حکمت، ممتاز عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد رحلت فرما گئے۔ اِک درخشندہ ستارا تھا جو ڈوب گیا، اِک چشمۂ فیضان تھا جو خشک ہو گیا۔ موت نے اس عالمِ باعمل کو ہم سے جدا کر دیا جو علومِ دینی سے قوم کو سرفراز کر رہا تھا۔

آج ڈاکٹر صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔ وہ ایک بلند اخلاق، پاک باطن انسان تھے۔ آپ کی ساری زندگی تحصیلِ علوم اور فروغِ علم میں بسر ہوئی اور یہی علم ان کی رفعت و بلندی کا سبب بنا۔ آپ کی زندگی کا سفر عزم و ارادے اور یقین کامل کے ساتھ طے ہو گیا۔ آپ آوازِ حق بلند کرنے والے بے خوف مجاہد، بافضیلت عالم اور قابل احترام معتبر شخصیت تھے۔ آپ کا مقصد احکامِ الٰہی کی تبلیغ، علم القرآن کی تحصیل اور تعلیماتِ قرآنی کی تعمیل رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا مقصد بہت واضح تھا۔ ان کے نزدیک قرنِ اوّل میں ''ایمان'' عبارت تھا دو حقیقتوں سے: ایک قرآن حکیم، دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔

آپ نے ''قیامِ پاکستان اور مذہبی طبقات کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے بھی کافی لکھا جو پسند کیا گیا۔ آپ کا ایمان تھا کہ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اذنِ ربّی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ پوری عمر ملک اور قوم کے مسائل کا حل تلاش کرتے رہے۔ آپ نے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی، جس کے تحت ۱۹۷۵ء میں قرآن اکیڈمی قائم ہوئی۔

☆ ایڈیٹر ماہنامہ ''فکر نو'' لاہور

آپ کو ۱۹۸۱ء میں حکومت کی طرف سے تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ قرآن اکیڈمی کا اہتمام اور قیام کا انتظام اس لیے کیا تا کہ زیادہ سے زیادہ علماء اور آرزومند طلبہ استفادہ کر سکیں۔ علم القرآن سے آپ کو وافر حصہ ملا تھا' اس لیے تحمل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کر کے ماحول کو خوشگوار رکھتے تھے۔ آپ کی ایک خوبی یہ تھی کہ تنقیدی گفتگو میں بھی باعتی راستہ اختیار کر لیتے تھے۔ آپ کو جس قدر علم و دانش' عرفان و حکمت ملا' وہ آپ کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ہمیشہ اپنی ذات پر اعتماد اور خدا کی تائید پر یقین کیا اور یہی بات آپ کی دینی اور دنیاوی کامیابی اور وجہ شہرت بنی۔

عوام کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے ابہامات اور شبہات اپنی فہم و فراست سے دور کرتے رہے' کیونکہ اگرچہ وہ علمی وحدت کے قائل تھے لیکن پھر بھی مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات آپ کی طرف سے غلط فہمی کا شکار رہے۔ ۲۰۰۵ء میں میری ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک شیعہ شاعرہ اور تبصرہ نگار ہونے کی حیثیت سے اپنی ایک کتاب ''شیعہ سنی مفاہمت کی ضرورت و اہمیت'' بصد خلوص مجھے پیش کی اور اس پر تبصرے کی خواہش ظاہر کی۔ میں انہیں بہت پہلے سے جانتی تھی' یہ ایک اچھی ملاقات تھی' بہت سے مسائل زیر گفتگو آئے۔ انہوں نے اپنے مخالفین کی بات کی تو میں نے اپنا ایک شعر سنایا' بہت محظوظ ہوئے:

ان کی رقابتوں کی منازل کو کیا کہیں جو آسماں کو زیر زمیں دیکھتے رہے!

میں نے اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد تبصرہ کیا جو اگست ۲۰۰۵ء کے شمارے ''میثاق'' میں شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ آپ کے خیالات سے آگاہی ہوئی' شاید اسی سے میں ان کی بامقصد فکر کو زیر بحث لاؤں گی جو ان کا حق اور میرا فرض ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب میں بالیدگی نظر اور وسعت پسندی کے ساتھ عالمانہ اور عارفانہ بحث کی ہے اور اس میں آپ کی فکری کوشش کے علاوہ وہ اسلامی جذبہ بھی شامل ہے جس کی وجہ یہ کتاب ہے' جبکہ کسی خاص عقیدے پر تبصرہ یا تنقید کرنا آپ کا کہیں بھی مقصد نہیں رہا۔ یہ آپ کی ایمان اور اسلام سے وابستگی کی علامت ہے کہ آپ نے اپنی تحریر میں فرض کی ادائیگی' وسعتِ نظری' فکری گہرائی' معاملہ فہمی' سچائی' دیانت داری اور اسلام شناسی کا خاص خیال رکھا ہے۔ وہ کمزور اعصاب کے انسان نہیں تھے۔ ان کے مضبوط اعصاب نے ہی انہیں کامیاب بنایا۔

مسلمانوں کے باہمی انتشار کے خاتمے اور اسلام کا حقیقی تعارف کرانے میں آپ کی

خدمات قابل ستائش ہیں۔ وہ قلب مطمئن اور آسودہ مزاجی کے ساتھ ہر آنے والے وقت کا مقابلہ کرتے تھے۔ تحریر اور تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم و کمال آپ کا ادبی ورثہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علمی بنیاد پر مقصد اسلام کا علمی' اخلاقی' نظریاتی اور روحانی تعارف کرایا ہے تاکہ اسلامی اصولوں سے شناسائی اور دین کی بنیاد مستحکم ہو اور اسے مؤثر طریقے سے نفاذ کے ذریعے عمل میں لایا جاسکے۔

دراصل اسلام کی رسمی ادائیگی اور چیز ہے جبکہ مکمل بصیرت و آگہی' آفاقیت اور حقانیت و استقامت اور معرفت سے اسلام کو سمجھنا اور بات ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کے ذاتی نظریات اور خیالات قارئین تک پہنچاؤں تاکہ باہمی تعصب اور غلط فہمی دور ہو سکے۔ آپ نے فرمایا کہ بعض مسائل و عقائد مثلاً روزہ' نماز' مسئلہ خلافت' مسئلہ غیبتِ امام مہدی' احادیث' زکوٰۃ' طلاق اور وراثت کے مسائل میں اگر مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے تو فرقہ واریت کی آگ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب اتحاد بین المسلمین کی طرف ایک روشن قدم ہے' لیکن اس سے استفادے کے لیے لازم ہے کہ قاری بالغ النظر اور متوازن شخصیت کا مالک ہو' تاکہ اسے صحیح مذہبی اقدار سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مختلف فقہی مسائل کی اہمیت اور حیثیت کا ذکر کیا ہے کہ ان کے لیے ہمارا طرزِ فکر کیا ہونا چاہیے۔ اس کے بعد شیعہ سنّی فقہی مسائل' تفرقہ بازی کے اسباب اور پھر ان کے نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ تمام اسلامی ممالک میں سے آپ نے ایران کی تعریف کی ہے کہ اُس نے اپنے مذہبی عقائد اور فقہ کے مطابق اسلام نافذ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پاکستان' ایران' افغانستان اور ترکستان کا ایک بڑا اسلامی بلاک بن سکتا ہے بشرطیکہ اتحاد کی کوئی بنیاد ہو اور ہمارے پاس اسلام سے زیادہ کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

اس مسئلہ کا حل ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ میرے نزدیک اس کا حل وہی ہے جو ایران نے اپنایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں تک عقائد' عبادات' مساجد' فیملی لاز اور وراثت کے قانون وغیرہ کا تعلق ہے تو ان میں ہر ایک کو مکمل آزادی ہو کہ وہ اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے' لیکن ملکی قوانین کے معاملے میں اُس فقہ کو نافذ کرنے کا اعلان کیا جائے جس کے ماننے والے اکثریت میں ہوں۔ عبادات کا معاملہ بھی ہر ایک پر چھوڑ دیجیے کہ وہ جس طرح

چاہے ادا کرے۔ یہ ایک طرح کا انفرادی معاملہ ہے اور زکوٰۃ کو بھی آپ نے عبادات میں شامل کیا ہے' لیکن جہاں تک ملکی قوانین کا معاملہ ہے تو ظاہر ہے کہ ایک ملک میں دو قانون نافذ نہیں ہو سکتے۔ کیا حدود و تعزیرات ہر ایک کے لیے الگ الگ ہو سکتی ہیں؟ اس کے لیے ایران سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے کہ وہاں دستور میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ ان تمام معاملات میں اکثریتی فقہ' فقہ جعفریہ کے مطابق فیصلہ ہوگا اور یہ بہترین حل ہے۔ پاکستان کے قانون میں یہ بات طے ہو جائے کہ فقہ حنفی کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہوگی' کیونکہ یہاں غالب اکثریت ان کی ہی ہے' لیکن اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ فقہ حنفی جو آج سے کئی سو سال پہلے نافذ کی گئی تھی جوں کی توں نافذ کر دی جائے گی' بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب جو اجتہاد ہوگا اور قانون سازی ہوگی وہ فقہ حنفی کے اصولِ فقہ کے مطابق ہوگی' یعنی استنباط اور استدلال کے اصول وہی ہوں گے جو فقہ حنفی کے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب کے خیالات اور نظریات جاننے کے بعد مجھ ناچیز کو یہی کہنا ہے کہ اسلام سے متعلق امور اور تجاویز پر آپ کی کاوشوں کو سراہنا چاہیے۔ قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں کی فضا کو ختم ہونا چاہیے۔ اعلیٰ سطح پر علمی مراکز قائم کیے جائیں جہاں تحقیق و تربیت کا کام اس پیمانہ پر ہو کہ ایسے علماء اور اساتذہ پیدا ہوں جو اسلام کے صحیح فہم کے ساتھ جدید دور کی ضرورت اور نظریات سے واقف ہوں اور اسلامی قانون کا بھی مقصد یہی ہونا چاہیے کہ اس کا بین الاقوامی تعارف کرایا جائے۔ صحافت کے میدان میں بھی اصلاحی و علمی تحقیق کو بڑھانا چاہیے تاکہ معاشرے میں پایا جانے والا جمود ختم ہو اور اعتماد بحال ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے دورانِ گفتگو میں نے کہا کہ ہمیں اور آپ کو سوچنا پڑے گا جو کچھ ہو گیا ہے اور جو ہو رہا ہے' فیصلوں کو اس منزل سے گزرنا ہوگا جو سخت مرحلہ ہے۔ دراصل ہمیں قرآن کے مطالعہ کی عادت ڈالنی چاہیے' اس سے ایمانی عقائد کی خود بخود تائید ہو جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ پاکستان صرف اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے لیکن ہم یہاں مکمل طور پر اسلام نافذ نہیں کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا عوام سے مضبوط حوالہ درسِ قرآن کا پروگرام ''الہدیٰ'' بنا ہے' باغ جناح سے لے کر کوئٹہ تک اس کے درس سنے گئے۔ وہ کمال کے مقرر تھے جس کی وجہ سے لوگ متاثر اور گرویدہ ہوتے چلے گئے۔

ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ ہماری منزل کیا ہے؟ ہم مسجدوں اور امام بارگاہوں سے کیا

پیغام دینا چاہتے ہیں؟ اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہم کب تک دوسروں سے بے معنی جنگ کرتے رہیں گے؟ آیئے! متحد ہو جائیں اور ان راستوں پر چلنا بند کر دیں جہاں چل کر قدم لہولہان ہو جاتے ہیں۔

آج ڈاکٹر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہمیں ان کے اسلامی جذبوں کی قدر کرنی چاہیے تاکہ ان کے افکار و تجربات کی روشنی میں ہم تحریک انقلابِ اسلامی کو آگے بڑھا سکیں۔ آپ سے عقیدت اور محبت کا خاص انداز یہ ہونا چاہیے کہ ہم آپ کی تقاریر اور تحاریر کو عام کر کے آپ کے منشور کو آگے بڑھائیں جو ایمان کی تقویت اور اللہ سے قربت کا سبب ہوگا۔

دنیائے علم میں آپ کی وفات ایک حادثہ ہے۔ ایک مجلس کمال تھی جو برخاست ہوگئی' ایک شیرازۂ حیات تھا جو بکھر گیا' ایک خوبصورت راستہ تھا جو موت کے فاصلوں میں کھو گیا۔ ہم سوگوار دلوں کے ساتھ انہیں خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ ہماری جانب سے سفرِ آخرت مبارک ہو۔ ہماری دعا ہے کہ پروردگارِ عالم مرحوم کے درجات بلند کرے' ان کی قبر پر اُس کی رحمت کا سایہ ہو۔

آئی ہے اجل دُور سے اک سانس کو لینے
پل بھر کو تو ہو جائے نگاہوں میں اُجالا

❁❁❁

ڈاکٹر اسرار احمد کی نذر

آیاتِ نفس میں تو عجب شور تھا برپا
گو سانس بھی گنتے رہے پر سانس میں کیا تھا

کمالِ علم تھا اتنا کہ اس کا ذکر ہو کیسے
کہ جن کی جنبشِ لب سے ہزاروں پھول کھلتے تھے

عقل حیراں ہے تمازت دیکھ کر
آگ میں کھلتے ہیں ایسے پھول بھی!

❁❁❁

اُستادِ محترم کی یاد میں

کاشف حفیظ صدیقی، کراچی

دنیا میں اربوں لوگ آباد ہیں، اربوں جا چکے ہیں، اور نہ جانے کتنے آنے باقی ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کی نہ زندگی ہی کوئی قابل ذکر واقعہ تھی اور نہ ہی ان کی موت۔ کم ہی لوگ ہیں جن کو کوئی خواب دیکھنا نصیب ہوتا ہے اور پھر ان سے بھی کم وہ ہیں جو اپنے خوابوں کے لیے جستجو کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو کسی نصب العین کے لیے اپنی زندگی لگا دیں ان کی مثال انبیائے کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ کم ہی لوگوں کی زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

استادِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ ایسے ہی چند خوش نصیب لوگوں میں سے تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی تو اب اخبارات اور ٹی وی کی وساطت سے آپ سب کو معلوم ہو ہی چکے ہوں گے۔ میرا اِس تحریر کا مقصد اس شدید تاثر کے زیر اثر ہے جو میری ذات پر ان کی وجہ سے مرتب ہوا، حالانکہ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا نام اوّل اوّل میں نے ایک مذہبی سیاسی جماعت کے ہفت روزہ میں پڑھا تھا۔ یہ شاید ۱۹۸۰ء کے اواخر کی بات ہوگی۔ کم عمری کی وجہ سے بس یہی کچھ سمجھ آیا کہ ان پر تنقید کی گئی ہے۔ کیوں؟ یہ اب یاد نہیں۔ بعد میں جب بھی ڈاکٹر صاحب کا نام سنا تو یہی سمجھ میں آیا کہ ایک صاحب ہیں جن سے ''احتیاط'' کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ گھر میں ان کی کیسٹس اور Qtv اور Peace TV پر ان کے بیانات آنے کے باوجود ان سے احتیاط ہی کرتا رہا، شاید اس لیے کہ ہر طرح کے علماء سے ہی احتیاط کرنا اُس وقت ہمارا لائف سٹائل تھا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے مجھے پے بہ پے کچھ واقعات کے بعد اپنے دین کی راہ دکھائی، جس پر اُس کا شکر واجب ہے اور اس سے مزید اور مسلسل ہدایت کی دعا ہے۔ جب گانے سننے کی عادت چھوٹی تو کچھ نہ کچھ سننا ضروری تھا، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے دروس و خطابات جو گھر میں پہلے سے موجود تھے وہ گاڑی میں لا ڈالے۔ آتے جاتے بیانات سننے میں پہلے تو سورۃ الفاتحہ

کے بیان نے مجھے بہت متاثر کیا اور پھر سورۃ البقرہ کا بیان ختم ہوتے ہوتے میں مکمل طور پر قائل ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نہ منکرِ حدیث ہیں اور نہ ہی گمراہ' اور یہ کہ ان کے بارے میں علماء کو غلط فہمیاں ہیں جو ان کو نہایت نیک نیتی کے ساتھ غلط معلومات فراہم کرنے والوں کی پیدا کردہ ہیں۔ (چنانچہ بعض علماء جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی وفات پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ان کی جامعات کی websites پر ڈاکٹر صاحب کی گمراہی کے فتاویٰ موجود رہے ہیں۔) کچھ اسی طرح کے مغالطے میں ضیاء الحق صاحب بھی آ گئے تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو کوئی لبرل قسم کا سکالر سمجھ کر اپنی مجلس شوریٰ میں شامل کر لیا تھا۔ وہ تو ڈاکٹر صاحب نے خود ہی دو ڈھائی مہینے بعد یہ کہہ کر استعفادے دیا کہ اس سے اسلام کی کوئی خدمت نہیں ہو رہی' ورنہ صدر صاحب کو تو یہ appointment گلے میں پھنس گیا تھا۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ایک دو کو چھوڑ کر تقریباً سبھی اخبارات اور چینلز نے ڈاکٹر صاحب کو تنظیم اسلامی کا سربراہ لکھا ہے جب کہ وہ ایک عرصہ سے اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اپنے عہدے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ گویا ہمارے ہاں اس بات کو عموماً ذرا بھی اہمیت نہیں دی جاتی کہ جس کے بارے میں بات کر رہے ہیں یا فیصلہ سنا رہے ہیں ان کے بارے میں کم از کم بنیادی معلومات حاصل کر لی جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت جس کا میں دل سے قائل ہو گیا' وہ ان کا آخرت پر غیر متزلزل یقین تھا۔ وہ اللہ کی قدرتِ کاملہ' ایمان' یقین' بعث بعد الموت' دنیا کی بے ثباتی اور قرآن کی حقانیت کو اتنا حقیقی اور واقعی طور پر بیان کرتے تھے کہ مجھ جیسے طالب علم ان کے اذعان (conviction) کے سیلاب میں بہہ جاتے تھے۔ ہماری مثال رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے مصداق عطر والے کے پاس بیٹھنے والے کی ہوتی ہے جو اور کچھ نہیں تو خوشبو ہی لے کر اُٹھتے۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اگر ان کی باتوں میں relevance دکھائی دیتی تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ بہر حال جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میں ان کی مزید تقاریر سنتا گیا' یوں سمجھ لیں کہ مجھے ان کی تقریر سننے کا چسکا لگ گیا۔ ان کی تحریروں سے میرا بک شیلف آباد ہو گیا اور قرآن اکیڈمی سے تعلق کا آغاز ہو گیا' جو کچھ مزید پاکیزہ شخصیات سے ملنے کا باعث بنا اور تا حال ان سے کسی نہ کسی صورت میں فیض جاری ہے۔

ان کے بیانات نے مجھے اپنے زندگی میں فرائض اور واجبات کو مقدم رکھنا سکھایا۔ ان

کے مجھ پر احسانات کو اگر میں دو کاموں تک محدود کروں تو پہلا تو انہوں نے قرآن کے ساتھ تعلق کو مضبوط بنانے میں مجھ جیسے ناظرہ قاری کی مدد کی جس نے لارڈ میکالے کے وضع کردہ طریق تعلیم میں ''Prophet Muhammad PBUH'' کی لائی ہوئی کتاب کو صرف چوم کے طاق پر رکھنا ہی سیکھا تھا' کجا یہ کہ اس پر عمل کرنے کی کوئی کوشش کرتا۔ دوسرا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ سیرتِ نبوی ﷺ کی ایسی انقلابی تصویر پیش کی کہ مجھ جیسا بزدل بھی یہ چاہنے لگا کہ زندگی ہو تو اسی مقصد کے لیے اور موت ہو تو اسی کے لیے۔ ہم جو آج تک ان تمام غزوات اور سرایہ کو محض دفاعی جنگیں ہی سمجھتے رہے اب خم ٹھونک کر ہر کہنے والے کو یہ جواب دینے لگے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے دنیا کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ ہاں وہؐ رسولِ رحمت تھے' ہاں وہؐ سراپا رحمت تھے' لیکن اسی رحمت کا تقاضا تھا کہ ان نافرمانوں کو راستے سے ہٹا دیں جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان رکاوٹ بنتے تھے۔ میں آپ کے بارے میں نہیں جانتا لیکن میرے لیے حضور ﷺ کی سیرت کی یہ تعبیر اتنی logical ہے کہ میں نے پھر کبھی علامہ شبلی کی لکھی ہوئی سیرت کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں میں علامہ سے برگشتہ نہ ہو جاؤں۔

انہوں نے اپنے مشن کی بنیاد دو کتابچوں کو بنایا۔ ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' اور ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام''۔ ان میں انہوں نے بنیادی طور پر دو باتوں کو پیش کیا۔ ایک تو یہ کہ قرآن کی دعوت کو اتنا عام کر دیا جائے کہ وہ کسی مقناطیس کی طرح معاشرے سے صالح افراد کو کھینچ نکالے اور جب یہ افراد میسّر آ جائیں تو ان کی ذہنی اور روحانی تربیت سے انہیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ مل جل کر اس باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور خلافت کی راہ ہموار ہو سکے۔ ان کتابچوں کو پڑھنے کے بعد آپ کو یہ بات سمجھ آ جائے گی کہ ڈاکٹر صاحب کے قول اور فعل میں تضاد بالکل نہیں تھا' وہ ہر جگہ وہی بات کرتے تھے جو ان کو صحیح لگتی تھی۔ مصلحت پسندی ان کا خاصہ نہیں تھی۔ انہوں نے جو کچھ ان کتابچوں میں تحریر کیا اس پر عمل کرنے کی مخلصانہ اور جان توڑ کوشش کی۔ پہلے انجمن خدام القرآن کی بنیاد ڈالی' پھر قرآن اکیڈمی' تنظیمِ اسلامی اور پھر تحریکِ خلافت کی۔ ان کی زندگی ایک logical progression میں آگے بڑھی اور وہ کمال استقامت کے ساتھ اپنے مشن میں آگے بڑھتے رہے۔ ان کی صحت بہت مثالی نہیں تھی' ان کے گھٹنے مصنوعی تھے اور کمر لوہے کی پلیٹوں کے سہارے ایستادہ تھی۔ انسولین کے انجکشن وہ خود اپنے آپ کو لگاتے تھے اور آخر عمر میں cortisones کا استعمال

کثرت سے کیا' جن کے مضر اثرات مسلّم ہیں' لیکن مقصد کے ساتھ لگن نے انہیں کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ تنظیم میں رکنیت سازی کی رفتار انتہائی کم ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی اپنے موقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی' بلکہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی آتی گئی۔

ان کی ذاتی زندگی میں اسلام کی application کا یہ عالم تھا کہ بچوں کی شادی میں نہ جہیز لیا اور نہ دیا۔ سوائے ولیمہ کے اور کوئی کھانا پوری شادی میں نہ کیا' مہندی مایوں تو دور کی بات ہے۔ بس مسجد میں نماز کے بعد نکاح پڑھایا اور بیٹی کو رخصت کر دیا۔ ان کی اس تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نامور صحافی (م ش مرحوم) نے لکھا تھا کہ ''ایک ٹن وعظ پر ایک چھٹانک عمل بھاری ہوتا ہے''۔ اپنے بڑے بھائی سے اس لیے ناراض ہو گئے کہ انہوں نے اپنی فیکٹری کے لیے سودی قرضہ لے لیا تھا۔ زندگی میں ہر قسم کے عہدے سے دور بھاگتے رہے۔ ضیاء الحق صاحب نے اپنی مجلس شوریٰ میں یہ کہہ کر شامل کیا تھا کہ آپ منبر سے مشورے دیتے ہیں یہاں آ کر مشورے دیں' لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ شوریٰ محض ایک نمائشی ادارہ ہے جس کی سفارشات پر عمل نہیں ہوتا تو فوراً استعفا دے کر باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے اساتذہ سے بھی اختلاف کیا۔ مولانا مودودیؒ سے جماعت کے اپنے تاسیسی ہدف سے ہٹ جانے کی بنیاد پر اختلاف کیا اور ان کی چند تفسیری آراء سے بھی اختلاف کیا۔ امین احسن اصلاحی صاحب نے رجم کی نفی کی تو علی الاعلان ان سے براءت اختیار کی۔ اقبال کی شاعری کے بے پناہ مداح ہونے کے باوجود ان کی خامیوں کو خامیوں کے درجے میں رکھا۔ غرض انہوں نے اپنے اساتذہ کو انسان ہی تصور کیا اور آج کل کی غلط روایات کے برعکس ان کی غلطیوں کی تاویل کرنے کی بجائے ان کو غلطیاں سمجھا' البتہ اختلاف کو ذاتیات کی حد میں (کم از کم میرے علم کی حد تک) نہیں آنے دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اتنے متنوع مکاتیب فکر کی باتیں نہ صرف سمجھ سکے بلکہ ان کے اختلافات کو ختم کرانے کی اپنی سی کوشش بھی کی۔ حقیقت و اقسامِ شرک پر ان کے خطابات اس بات کا ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کرامت شاید یہی تھی کہ عصرِ حاضر اور علومِ اسلامیہ پر گہری دسترس رکھنے کے باوجود وہ کبھی علمیت کے تکبر کے فتنے میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان سے کچھ لوگ ناراض بھی ہیں لیکن وہ زیادہ تر جذبات کی بنیاد پر فیصلے سناتے ہیں۔ ان کی میراث سوائے علم کے اور

کچھ نہیں۔ ان کے شاگردوں میں سے خود ان کے خلف الرشید اور تنظیم کے امیر جناب حافظ عاکف سعید' ان کے بڑے صاحب زادے عارف رشید' ڈاکٹر عبد السمیع اور کراچی میں انجینئر نوید صاحب کی ان کے ساتھ طویل رفاقت ہے اور وہ مکمل طور پر فکر میں ڈاکٹر صاحب کا پرتو اور مشن میں ویسے ہی committed ہیں۔

اس جمعے کو میں سوچتا ہی رہ گیا کہ کیا کروں؟ شاید لاکھوں لوگ جو پوری دنیا میں ان کا ہفتہ وار درس سننے کے عادی ہو گئے تھے وہ اپنے آپ کو معنوی طور پر ویسے ہی یتیم سمجھ رہے ہوں گے جیسے کہ میں! استاد محترم سے زندگی میں کوئی ملاقات نہ ہونے کا افسوس نہیں ہے' کیونکہ کچھ لوگ نہ مل کے بھی دل سے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ ملاقات کے تکلف کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کی وفات پر صدمہ سے زیادہ ان کی اللہ کے رسول ﷺ کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے اس دنیا سے جانے کی خوشی ہے' لیکن یہ ساری محنت یقیناً ان کی ہی محنت تصور ہوگی۔ ہم سب کو تو اپنے عمل کے ساتھ اپنے رب کے ہاں پیش ہونا ہے۔ دل ان کے لیے دعا گو ہے اور آنکھ بار بار نم ہو جاتی ہے' لیکن اللہ نے جب ان کو اپنے پاس بلانا مقدر کیا اس پر راضی ہیں۔ ان کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ بندہ اگر زندگی میں کوئی اعلیٰ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے تن من دھن لگائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ انہوں نے اپنے پیشے کو خیر باد کہہ دیا تھا اور باوجود یکہ وہ ایک ڈاکٹر تھے' ان کی پہچان اول اور آخر ایک داعی کی ہے۔ سچ پوچھیں تو انہوں نے اتنی مشکل زندگی گزار کر ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث پر دل سے ایمان رکھتے تھے کہ ''تم میں بہترین وہ ہیں جو قرآن کو سیکھیں اور اسے (دوسروں کو) سکھائیں۔''

ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت کے لیے خراج عقیدت پیش کرنے کا طریقہ صرف اور صرف یہ ہے کہ عملی طور پر وہ کام کیا جائے جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی لگائی' ورنہ خالی خولی تعریف سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ کاش اپنے رب سے میں بھی ایسے ہی ٹوٹ کر محبت کر سکوں جیسے کہ استاد محترم نے کی..... کاش اس سے زیادہ..... جیسے بمصداق حدیث: ''جس نے محبت کی اللہ کے لیے اور بغض رکھا اللہ کے لیے اور دیا تو اللہ کے لیے اور روکا تو اللہ کے لیے' اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔''

❁❁❁

موت العالم موت العالم

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تُو کجا بہرِ تماشا می رَوی؟

ڈاکٹر محمد مقصود مردان

آہ! پچاس سال سے درسِ قرآن کے حوالے سے شہر لاہور کے اُفق پر چمکنے والا سورج ہمیں مغموم و افسردہ چھوڑ کر بالآخر ۱۴ اپریل کو غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! وہ شخصیت جس نے تصویرِ کہن میں رنگ بھر کر اور ایامِ سلف کا قصہ ایک نئے جوش، نئے رنگ اور سحر انگیز اسلوب میں سنا کر ہم سب کو بے اختیار تڑپا دیا اور اسلام کی عظمتِ رفتہ کی حسین یادداشت کو ایک بار پھر اذہان و قلوب میں تازہ کر دیا۔ علامہ اقبال نے نظم اور مولانا ابوالکلام اور مولانا مودودی نے نثر کے ذریعے احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جس جذبے کی آبیاری کی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے خالص قرآنی بنیادوں پر اسی جذبے کو reconstruct کر کے اس کی تپش سے ہمارے دلوں کو گرما دیا اور انسانی استطاعت کی حد تک اپنے حصے کا کام کر کے اقامتِ دین کے قافلے کا یہ تھکا ماندہ مسافر اور بے چین و بے قرار حُدی خواں اپنے تمام تر ارمانوں کے ساتھ اپنی قبر کی گہرائیوں میں محوِ خواب ہوا:۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

اوپر فارسی زبان کے جس شعر سے مضمون کا سرعنوان باندھا گیا ہے وہ مرحوم ڈاکٹر اسرار احمد کے متعلق ذاتی طور پر میری اپنی باطنی کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ میں اپنے طالب علمی کے زمانے سے جب بھی لاہور آتا یہ آرزو اور تمنا لے کر آتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی محفلِ درس میں شریک ہو کر آتشِ ایمانی سے اپنا سینہ خوب گرماؤں گا اور اس بے مثال مردِ درویش کی قلبی حرارت و نورانیت سے امکانی حد تک مستنیر ہونے کا سامان کروں گا۔ مرحوم کو بھی میں نے ہمیشہ اسی حوالے سے بے تاب پایا کہ اجتماعات یا تربیت گاہوں کے

موقع پر جلد از جلد اور بلا تاخیر رفقاء کے درمیان آ کر اُن کو نورِ قرآنی سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع دیں۔ یوں ایسے مواقع پر مرحوم کے چہرۂ انور کی زیارت بھی ہو جاتی اور تشنگانِ علم و آگہی کے جذبۂ ایمانی کی آبیاری بھی ہوتی۔ مگر ۱۴/اپریل کی شام کو میں نے ایک عجیب اور برعکس منظر دیکھا کہ ہم حسبِ معمول جس مردِ خدا مست کے چہرۂ مبارک اور جذبۂ ایمانی کا نظارہ کرنے جمع ہوئے' وہ اپنے گزشتہ طرزِ عمل کے برخلاف اپنے شیدائیوں کی محفل چھوڑ کر (سفرِ آخرت کا) کوئی اور تماشا دیکھنے نہایت سرعت سے باہر نکل گئے۔ مردان سے لاہور پہنچ کر میری نظر جنازہ گاہ کی طرف بڑھتی ہوئی ایمبولینس پر پڑی جس کی فرنٹ سیٹ پر امیر تنظیم جناب حافظ عاکف سعید صاحب بیٹھے تھے تو میرے لبوں پر بے اختیار کسی نامعلوم شاعر کے یہ الفاظ آ گئے کہ ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی؟

''اے وہ عالی مرتبت انسان کہ عشاق آپ کے چہرے کا دیدار کرنے کے لیے اُمڈے آتے تھے۔ آج آپ ان کی محفل کو افسردہ چھوڑ کر کوئی اور تماشا دیکھنے کہاں چلے گئے؟''

مؤمن و کافر کی زندگی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کافر دنیائے دوں کو ہی اپنا اصلی گھر سمجھتا اور عدالتِ اُخروی کی کسی قسم کی جوابدہی کو محض واہمہ قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے کسی قسم کی بے قراری کا شکار نہیں ہوتا۔ مگر ایک مؤمن حدیث نبویؐ: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) ''دنیا میں ایسے رہو جیسے تم اجنبی ہو یا راہ چلتا مسافر'' کے مصداق دنیا کو محض ایک عارضی قیام گاہ سمجھتا اور احتسابِ آخرت کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ یا پھر اس سوار کی طرح سوئے منزل مصروفِ خرام ہوتا ہے جس کے متعلق رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے دنیا سے کیا سروکار' میری اور دُنیا کی مثال تو اُس سوار کی سی ہے جو کچھ دیر کے لیے کسی درخت کے سائے میں ستانے کے لیے ٹھہرتا ہے' پھر چل پڑتا ہے اور اسے چھوڑ جاتا ہے''۔ اس علم و آگہی کے بعد ایسا شخص دنیا میں رہ کر ایک جانب تو بقول شاعر ''احتسابِ اُخروی کے خوف سے ''پُر درد'' اور ''رُخ زرد'' ہوتا ہے ؎

آں کہ او آگاہ تر پُر درد تر
آں کہ او بیدار تر رُخ زرد تر!

تو دوسری طرف اس عارضی قیام گاہ کو چھوڑ کر اپنے اصلی گھر لوٹنے کے لیے بے قرار و مضطرب رہتا ہے۔ میں سفر و حضر میں جتنا بھی مرحوم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہا ہوں میں نے ہمیشہ انہیں اس درد کا درد آشنا اور اس قسم کے خوف و خشیت سے مغلوب پایا۔ مرحوم کی پوری زندگی ایک بے چین و بے قرار روح کی تابندہ مثال تھی۔ شہرِ لاہور کے در و دیوار گواہ ہیں کہ انہوں نے محاسبۂ اُخروی کے اس مخصوص درد کو ہر ہر شخص کے ساتھ بانٹا' ہر ہر فورم پر بیان کیا اور اس حقیقت کو نہایت دل سوزی سے واشگاف کیا کہ ہمارا اصلی گھر دنیا نہیں آخرت ہے..... آخرت ہے۔ عارضی اور دائمی گھروں کی یہ تقسیم اور دائمی گھر کی طرف لوٹنے کے لیے بے قراری کی یہ کیفیات ہمیں عارفینِ اُمت کے ہاں ملتی ہیں۔ چنانچہ عدالتِ اُخروی کے خوف سے بے چینی اور اپنے وطنِ اصلی کی طرف مراجعت کے لیے بے قراری کا ڈکھڑا عارف رومی ان الفاظ میں سناتے ہیں:

من بھر جمعیتے نالاں شُدم
جفت خوشحالاں و بدحالاں شُدم
سینہ خواہم شرح شرح از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

''میں نے ہر طبقے اور ہر جمعیتِ انسانی کے قریب جا کر اپنے اس درد کا رونا رویا (کہ دوستو اور بھائیو ع ''سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم'' کے مصداق ہمارا اصلی گھر یہ دنیا نہیں وہ دنیا ہے) میں اُمراء (خوشحالاں) کے ساتھ بھی ملا اور غرباء (بدحالاں) کے سینوں کو بھی ٹٹولا' مگر تجربہ سے محسوس ہوا کہ شہرت و ناموری اور ''معیارِ زندگی کو بلند کرنے'' کا درد تو ہر طبقہ میں موجود ہے مگر میرے مطلوبہ درد کا دُور دُور بھی پتا نہیں۔ مجھے تو اس سینے کی تلاش ہے جو وطن اصلی سے دوری کے دردِ فراق سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہو تا کہ ایسے ہمدم و ہمراز کے ساتھ بیٹھ کر میں اپنا درد بانٹ سکوں۔''

رومی کو اپنا شریکِ درد کیوں نہیں ملا؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ میں جس درد کو ڈھونڈ رہا ہوں اس کا ادراک حواسِ ظاہری سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے اعلیٰ تر روحانی حواس کی ضرورت ہے اور جب تک انسان مادیات کے دھندلکوں سے ممکنہ حد تک فارغ و بے ہوش نہ ہو گیا ہو اس روحانی درد کا ہوش اس کو possess نہیں کر سکتا۔ بالفاظِ دیگر جو شخص زخارفِ دُنیا

کی دلچسپیوں سے حد درجہ بے ہوش نہ ہو گیا ہو میرے اس روحانی درد کا ہوش وہ کبھی پا نہیں سکتا' جس طرح زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا ادراک کرنا کانوں کا کام ہے' ناک کان اور آنکھ کے لیے یہ ادراک ممکن نہیں ۔

محرمِ ایں ہوش جز بے ہوش نیست
مر زباں را مشتری چوں گوش نیست

رومی اپنے شعر میں مادیات سے ''بے ہوش'' اور روحانیات میں ''باہوش'' جس فردِ فرید کا ذکر کر رہے ہیں' مرحوم ڈاکٹر اسرار احمد کو میں نے اپنے علم و تجربہ کی روشنی میں اس صدی کا ایک مثالی اور منفرد ''بے ہوش'' پایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ذہانت' تعلیم اور دولت کے بل بوتے پر دلدادگانِ دُنیا ہفت اقلیم کی بادشاہت حاصل کرنے کے بعد بھی هَلْ مِنْ مَّزِیْد کی آگ میں برابر جلتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بفضل خدا یہ تینوں چیزیں موجود تھیں' مگر عین طالب علمی کے زمانے میں جس دن اس مردِ حر نے اقامتِ دین کی جدوجُہد اور رضائے الٰہی کے داعیے کا ''ہوش'' پایا دنیائے دوں کی باقی ہر خواہش ہر آرزو اور ہر اُمنگ سے ''بے ہوش'' ہو کر حضرت مجذوب کے اس قول کا مصداق بن گئے کہ ۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی!

مرحوم اپنی زندگی میں کوئی بڑا اور وقیع کام نہ بھی کر سکتے (اگرچہ ایسا نہیں ہے) تب بھی وہ صد بار لائقِ تحسین و آفرین ٹھہرتے' کیونکہ جرأتِ رندانہ کی جس ''شان بے نیازی'' کے ساتھ انہوں نے جسم و جان کی جملہ صلاحیتوں کو غلبۂ دینِ حق کی جدوجُہد میں لگا دیا اور جس پائے حقارت سے دنیائے دنی کے مناصب کو ٹھکرا دیا یہی ''شان'' ہی انسان کا طرۂ امتیاز ٹھہرتی ہے۔ جان تو آنی جانی ہے' جو لوگ جان کو بچا بچا کر رکھتے ہیں بالآخر ان کی جان بھی ایک نہ ایک دن چلی جائے گی اور جو لوگ کسی مقصدِ عظیم کے لیے اسے خرچ کر کے لٹاتے ہیں ان کی جان بھی آخر کار چلی جانے والی ہے' مگر آسمان و زمین کا فرق ہے جان بچا بچا کر چلے جانے اور جان لٹا لٹا کر چلے جانے میں۔ جان بے شک دونوں صورتوں میں چلی جاتی ہے مگر جان دینے کی وہ ''شان'' باقی رہتی ہے' بقول فیض ؏

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے!

مرحوم کی پوری زندگی بچا بچا کر نہیں ایک مقصدِ وحید کے لیے جان لٹا لٹا کر گزری۔ یہی وہ متاعِ فقیری ہے جس نے انہیں اپنے زمانے کا سب سے بڑا اور نرالا ''امیر'' بنا دیا۔ آب و گل کے زندانی امارت و تونگری پر جان چھڑکتے ہیں مگر اس عارف باللہ نے غریبی میں نام پیدا کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ یہ عظیم مردِ قلندر بالآخر عمر بھر کی بے قراری سے چھوٹ کر عالمِ قرار کی طرف رخصت ہوا مگر دینی فرائض کے حوالے سے ایک عظیم امانت اور بڑی ذمہ داری ہمارے سپرد کر دی۔ مرحوم کے بغیر بھی حیاتِ دنیوی کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ یہاں شیراز کے بلبل بھی نغمہ سنج ہوں گے اور مستقبل کے خدوخال پڑھنے والے دیدہ ور بھی اپنا جلوہ دکھائیں گے' دلوں پر سحر کرنے والے دیوانے بھی پیدا ہوں گے اور عقل و استدلال کی کڑیاں جوڑنے والے فرزانے بھی اپنا جوہر دکھائیں گے' مگر دلوں کی دنیا میں ہلچل مچا دینے والا ڈاکٹر اسرار احمد جیسا ناوک فگن (تیرانداز) عاشقِ قرآن شاید پھر ہمیں نہ مل سکے کہ بقول شاعر۔

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اب بھی رمزِ قرآنی کی تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

❁❁❁

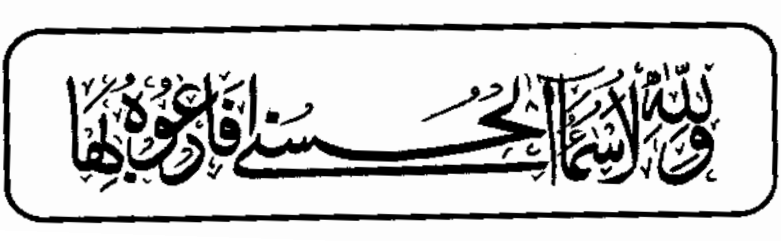

موت العالم موت العالم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
ایک کارکن کی نظر میں

عبدالمتین مجاہد☆

داعیٔ قرآن، بانی تحریک خلافت و تنظیم اسلامی، پاکستان کے عظیم دینی سکالر، مفکرِ اقبال اور مفسر و مبلغ قرآن محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میں نے زندگی کے تقریباً ۲۰ سال گزارے۔ مَیں ۱۱ جون ۱۹۹۱ء کو قرآن اکیڈمی میں ملازم ہوا تو مجھے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلامی جمعیت طلبہ کے سابق ناظم اعلیٰ، تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر اور قرآن کے ایک داعی ہیں، اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن قرآن اکیڈمی میں ملازمت کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کتنے عظیم دانشور، فکرِ اقبال کے صحیح معنوں میں ترجمان اور قرآن کے داعی، مبلغ، مدرس، خادم، مفکر و مفسر ہیں۔

اُن کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ وقت کے پابند، تکبر و غرور اور بغض و حسد سے مبرّا تھے۔ ان کے تمام بیٹے، بیٹیاں اور داماد بلکہ یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اُن کے خاندان کے تقریباً تمام افراد اُن کے اس قرآنی اور دینی مشن میں اُن کے دست و بازو تھے۔ یہ اُن کی شخصیت کے کردار و عمل کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اپنے تو اپنے بیگانے بھی اُن کے عمل و کردار کی رفعت کے معترف ہیں۔ آپ ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں'' کی عملی تفسیر تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی قرآن اور دین اسلام کی خدمت میں گزار دی۔ وہ آخری سانس تک اپنے اس قرآنی مشن کی اشاعت میں لگے رہے اور امر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

☆ اسسٹنٹ لائبریرین، قرآن اکیڈمی لاہور

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چند یادگار لمحات

(۱) ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میرا پہلا یادگار سفر گوجرانوالہ کا تھا' جس میں انہوں نے صبح کے وقت چیمبر آف کامرس گوجرانوالہ میں اور شام کو شیرانوالہ باغ میں خطاب فرمایا۔ ان پروگراموں میں وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھا اور باڈی گارڈز و پروٹوکول کے بغیر سفر کیا۔ یہ معاملہ اس سفر کے ساتھ خاص نہیں تھا' بلکہ تمام زندگی کا معمول یہی تھا۔ حتیٰ کہ جن دنوں ایک مخصوص گروہ کی جانب سے مخالفت عروج پر تھی اور قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں' اُن دنوں بھی آپ نے باڈی گارڈز وغیرہ کا تکلف گوارا نہیں کیا۔

(۲) دوسرا یادگار سفر پشاور کا تھا' جہاں دیوبند کانفرنس میں شرکت کی اور نوشہرہ کینٹ میں کچھ دیر قیام کیا۔ یہ سفر بھی سادگی کا مظہر تھا۔

(۳) اپریل ۲۰۰۴ء میں ننکانہ صاحب تشریف لائے تو میرے غریب خانے پر دو دن اور ایک رات قیام فرما کر میرے لیے اعزاز بخشا۔ یہ میری زندگی کا انتہائی ناقابل فراموش واقعہ ہے۔

انہوں نے نماز عصر کے بعد الہدیٰ لائبریری کا افتتاح فرمایا اور رات آٹھ بجے سیرت النبی ﷺ کے جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ اگلے دن صبح ۱۰ بجے گورنمنٹ گرونانک ہائی سکول میں طلبہ سے خطاب کیا اور دوپہر کو وکلاء کی خواہش پر بار ایسوسی ایشن ننکانہ میں خطاب فرمایا۔ شام کو اہلیانِ ننکانہ صاحب کی طرف سے ان کے اعزاز میں عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں سوال و جواب کی ایک نشست بھی ہوئی۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو شدید بخار تھا' اس کے باوجود آپ نے وقت مقررہ پر تمام پروگراموں میں شرکت فرمائی' خطاب فرمایا اور اہلیانِ ننکانہ صاحب کے دل و دماغ کو سیرت النبی ﷺ' فکر اقبال اور استحکام پاکستان جیسے موضوعات سے تر و تازہ کیا اور آخر میں عصرانے میں سوال و جواب کی نشست سے لوگوں کی رہنمائی فرمائی۔

طلبہ' تاجر حضرات' سیاسی رہنماؤں' وکلاء برادری اور ڈاکٹر حضرات نے ان جلسوں میں پورے ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کی۔ سیرت النبی ﷺ کے جلسۂ عام کے موقع پر لائٹ تقریباً آدھ گھنٹہ خراب رہی اور مکمل طور پر اندھیرا تھا' لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے اٹھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جب لائٹ آئی تو حاضرین کا یہ شوق دیکھ کر آپؒ نے فرمایا: ''آپ حضرات واقعی

مجھے سننے آئے ہیں!'' یہاں ایک اور اہم بات کی طرف توجہ دلاتا چلوں کہ سیاسی رہنما پروگراموں میں ہمیشہ لیٹ ہی آتے ہیں' لیکن وہاں کے تحصیل ناظم پیر ممتاز شاہ صاحب اور ڈاکٹر عبدالحی صاحب وقت مقرر سے بھی تقریباً پون گھنٹہ پہلے جلسہ گاہ میں پہنچ کر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ واقعہ میری زندگی کا گراں قدر سرمایہ ہے کہ ایک ایسے عظیم دانشور نے میرے گھر پر قیام فرمایا جس کو ملنے کے لیے لوگ ترستے ہیں۔ یادیں تو بہت زیادہ ہیں جن کو لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب بن جائے۔ آخر میں اُن کے لیے بس یہی کہوں گا کہ ع ''اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا!''

وہ قرآن اور سنتِ رسول ﷺ کے داعی و مبلغ تھے اور فکرِ اقبال کے صحیح معنوں میں ترجمان تھے۔ اُن سے میں نے زندگی کے تمام گوشوں میں رہنمائی حاصل کی۔ دین کا صحیح تصور' منہج انقلاب نبویؐ' فرائضِ دینی کا جامع تصور' جماعت کی ضرورت و اہمیت اور قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے' دنیا میں زندگی گزارنے کا ہمارا مقصد کیا ہے' یہ سب کچھ میں نے اِن سے سیکھا اور سمجھا۔ وہ میرے بچوں سے پیار کرتے تھے' اُن سے ہاتھ ملاتے تھے اور بچے بھی اُن کو دادا ابو کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے' اُن کے درجات بلند فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! وہ اس شعر کا مصداق تھے ؎

کلیوں کو میں سینے کا لہو دیتا رہا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی!

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

خادمِ قرآن: کچھ یادیں، کچھ باتیں

حافظ محمد زبیر

راقم الحروف کا محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے پہلا شعوری تعارف گریجویشن کے دوران ۱۹۹۸ء میں ہوا اور اس کا ذریعہ ''حقیقت واقسامِ شرک'' پر ان کی چھ عدد آڈیو کیسٹس بنیں۔ توحید و شرک کے موضوع پر ان کا یہ خطاب اس قدر جامع و مانع تھا کہ اس نے ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے ایک تعلق قائم کر دیا۔ اس کے بعد اپنے گاؤں پنڈی گھیپ، ضلع اٹک میں ہی ڈاکٹر صاحب کی قائم کردہ تنظیم اسلامی کی چھوٹی سی لائبریری سے رابطہ قائم ہوا اور ان کی اکثر و بیشتر کتابیں اور خطبات نہ صرف ازبر کر لیے بلکہ چھوٹے موٹے دروسِ قرآن کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ گریجویشن کے بعد میرا پروگرام Maths میں M.Sc کرنے کا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے خطبات نے ذہن تبدیل کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم قرآن کی تعلیم و تعلم پر بہت زور دیتے تھے، بلکہ دُنیاوی تعلیم یافتہ افراد کے لیے تو قرآن کی تعلیم کو فرض قرار دیتے تھے۔ پس راقم نے بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے گریجویشن کے بعد ۱۹۹۹ء میں قرآن اکیڈمی، لاہور میں ایک سالہ کورس کے لیے داخلہ لے لیا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں رُعب اور دبدبے کا عنصر بہت غالب تھا۔ اس لیے ان سے براہِ راست ملاقات یا بات کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ایک سالہ کورس کے دوران ڈاکٹر صاحب سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے راقم کو تعلیم پر توجہ دینے کی نصیحت کی۔ مئی ۲۰۰۰ء میں ایک سالہ کورس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے کلاس کے ساتھ الوداعی ملاقات کی جس میں سوال و جواب کا سیشن بھی ہوا۔ راقم نے ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کیا کہ ایک سال پڑھنے کے بعد بعض طلبہ میں قرآن و سنت اور دین کا مزید علم حاصل کرنے کی خواہش بڑھ گئی ہے، اب آپ کے پاس اس بارے میں کیا پروگرام ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: فی الحال تو ہمارے پاس ایک ہی سال کا پروگرام ہے، آپ مزید پڑھنا چاہتے ہیں تو اسلامی

یونیورسٹی چلے جائیں۔

اس کے بعد راقم الحروف نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں درس نظامی کے سہ سالہ کورس میں داخلہ لے لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جامعہ رحمانیہ لاہور سے درس نظامی کی تکمیل کی اور وہاں کچھ عرصہ تدریس بھی کی۔ اس دوران قرآن اکیڈمی سے تعلق تقریباً منقطع رہا۔ دسمبر ۲۰۰۵ء میں راقم قرآن اکیڈمی کے شعبہ تحقیق وتدریس سے وابستہ ہوگیا تو ایک دفعہ پھر اکیڈمی سے رابطہ جُڑ گیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے گاہے بگاہے ملاقات رہتی تھی اور اکثر وبیشتر ملاقات ان کے بلانے پر ہی ہوتی تھی۔ وہ خطبۂ جمعہ کی تیاری کے لیے اکثر وبیشتر احادیث کی تخریج وتحقیق کا کام بندۂ ناچیز سے لیتے تھے۔ کیونکہ وہ خود کمپیوٹر کے استعمال سے بالکل ناواقف تھے۔ ڈاکٹر صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ میرا تعلق Pre Computer Era سے ہے۔

فقہی مسائل میں اپنی رائے کے اظہار کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب مرحوم وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنظیم میں حنفی اور سلفی دونوں مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے رفقاء اور کارکنان موجود ہیں اور ان کی مقبولیت دونوں مکاتب فکر کے معتدل مزاج علماء کے ہاں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ راقم الحروف کو ایک ملاقات میں کہنے لگے: مجھے عبادات میں اہل حدیث کا طریقہ پسند ہے اور معاملات میں حنفی فقہ کو مبنی بر اعتدال سمجھتا ہوں۔ اس اعتبار سے ان کو 'مجمع البحرین' کا لقب دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ میرے خیال میں یہ تقسیم بھی ایک موٹی سی تقسیم ہے' حقیقت میں وہ نہ پورے طور پر حنفی تھے اور نہ ہی اہل حدیث' بلکہ اپنی ذاتی تحقیق' مطالعہ اور رائے پر اعتماد کرتے تھے' چاہے وہ ان دونوں مسالک کے مفتیٰ بہ قول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو' جیسا کہ مزارعت کے مسئلے میں ان کی رائے حنفی اور اہل حدیث دونوں مسالک کے مفتیٰ بہ قول کے خلاف تھی اور اس مسئلے میں وہ مولانا طاسین صاحب کی رائے پر اعتماد کرتے ہوئے مزارعت کو مطلقاً ناجائز قرار دیتے تھے۔ اسی طرح آخر عمر میں وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے معاملے میں امام ابن تیمیہؒ کے مسلک پر اعتماد کا اظہار کرتے تھے۔

عبادات میں وہ جہراً اور سراً دونوں طرح سے نماز جنازہ پڑھا لیتے تھے۔ رمضان المبارک کی طاق راتوں میں نمازِ وتر سلفی طریق سے ادا کرتے تھے اور دعائے قنوت بالجہر پڑھتے تھے۔ سری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے جو کہ امام مالک' امام احمد اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔ نماز میں رفع الیدین کے قائل تھے اور انفرادی نمازوں میں

رفع الیدین کرتے تھے۔ جماعت میں اگر امام صاحب رفع الیدین کرتے تو وہ بھی کر لیتے تھے لیکن اگر امام صاحب نہ کرتے تو وہ بھی نہ کرتے تھے' اور اس کی توجیہہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہمیں امام کی اقتدا کا حکم ہے۔ اب یہ نہ تو حنفی مسلک ہے اور نہ ہی اہل حدیث کا موقف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فقہی مسائل میں پانچ ائمہ یعنی امام مالک' امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام احمد اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ اجمعین کی آراء میں سے کسی کی رائے اور تحقیق پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اسے اختیار کر لیتے تھے اور قدیم مسائل میں ان پانچ ائمہ کی آراء سے باہر نہ نکلتے تھے۔ فقہی اقوال کے ترک واختیار میں ڈاکٹر صاحبؒ کا منہج اس وقت علمی سطح پر عالمی منہج کے طور پر سامنے آ رہا ہے اور عالم اسلام ایک ایسی فقہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے جو جمیع مذاہب اسلامیہ سے ماخوذ ہوگی اور اسے اسلامی فقہ یا ''کوسموپولیٹن فقہ'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ عالمی سطح پر علماء کی اجتماعی اجتہاد کی مجالس کے قیام کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ میں ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ اگر ان پر اپنے موقف کی غلطی واضح ہو جاتی تھی تو اس سے بلا تأمل رجوع فرما لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے علامہ اقبال مرحوم کے نظریۂ اجتہاد پر کچھ تحریر فرمایا۔ اس پر راقم نے یہ نقد کی کہ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کا جو نقطۂ نظر بیان کیا ہے' وہ صحیح نہیں ہے اور اس کے دلائل بیان کر کے پرنٹ نکال لیا۔ بعد میں راقم کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحبؒ پر نقد میں الفاظ میں شاید کچھ سختی آ گئی ہے' لہٰذا عبارت کو نرم بنانا چاہیے۔ راقم نے اس عبارت کو کچھ نرم بنایا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کو پیش کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نقد کو دیکھ کر راقم کی حوصلہ افزائی کی اور اپنے موقف سے رجوع فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا: عبارت کو نرم بنانے کی ضرورت نہیں تھی' جیسے پہلے لکھا تھا ویسے ہی لکھو کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے اقبال مرحوم کا نقطۂ نظر درست نہیں سمجھا ہے اور پھر خود ہی راقم کی سابقہ عبارت کو دوبارہ لکھ کر کہا کہ اب اسے شائع کروا دو۔

اگرچہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کو ڈاکٹر صاحب کے بعض نظریات کے ساتھ کچھ اختلاف بھی رہا ہے لیکن ڈاکٹر صاحبؒ اپنے ان نظریات کے بارے یہی توجیہہ پیش کرتے تھے کہ یہ میرے ذاتی افکار ہیں اور ان کا میری تنظیم یا اس میں شمولیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے بقول تنظیم اسلامی کی بنیادی فکر چار بنیادی مباحث پر مشتمل ہے:

۱) اسلام مذہب (religion) نہیں بلکہ ایک دین ہے' جس میں انفرادی زندگی کے ساتھ اجتماعی زندگی سے متعلق بھی ہدایات اور رہنمائی موجود ہے۔

۲) ایک مسلمان کے بنیادی فرائض تین ہیں: عبادتِ ربّ (زندگی کے ہر گوشے میں)' دعوتِ دین (پورے دین اور خصوصاً قرآن کی)' اور اقامتِ دین کی جدّوجُہد (یعنی نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لیے کوشش کرنا)

۳) منہج انقلابِ نبویؐ' یعنی تنظیم اسلامی کا دین کو قائم کرنے کا طریقۂ کار نہ تو صرف تبلیغی اور دعوتی سرگرمیوں تک محدود ہے اور نہ ہی عسکری نوعیت کا ہے' بلکہ احتجاجی اور انقلابی طریقۂ کار ہے۔

۴) جماعت کی بنیاد 'بیعت جہاد' ہوگی۔ اور جہاد سے مراد صرف قتال نہیں بلکہ وسیع معنوں میں جہاد مراد ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا کہنا یہ تھا کہ جسے ان چار بنیادوں سے اتفاق ہو' چاہے وہ سلفی ہو یا حنفی' تنظیم میں شامل ہوسکتا ہے۔ اور تنظیم میں شامل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر مسئلے میں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق پر اعتماد کرے یا فقہی مسائل میں ان کا مقلّد بن جائے یا ان کے عقائد اور افکار کی پابندی کرے۔ اس طرح کی لچک نے حنفی اور سلفی دونوں قسم کے نوجوانوں کو ڈاکٹر صاحب کی تنظیم کے قریب کر دیا۔

ڈاکٹر صاحبؒ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کو بیان کرنے میں کسی کی ملامت کی پروا نہ کرتے تھے' ان میں جرأت ایمانی بہت زیادہ تھی۔ آپ پابندیٔ وقت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے اور وقت کو بالکل بھی ضائع نہ کرتے تھے۔ عین نماز کے وقت مسجد میں تشریف لانا اور اگر تین یا چار منٹ بھی نماز میں رہتے ہوں تو فوراً نفل نماز کی نیت باندھ لینا' ان کا روزہ مرہ کا معمول تھا۔

قرآن اور دین اسلام کی خدمت میں محترم جناب ڈاکٹر صاحبؒ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نوجوانوں کی زندگیوں کا رُخ تبدیل کر دیا۔ ان کے کام کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کا کام لیا ہے۔ پہلے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ انبیاء ورسل کو دنیا کی اصلاح کے لیے بھیجتے تھے جبکہ نبی آخرالزماں ﷺ کی اُمت میں یہی کام اللہ تعالیٰ علماء اور اپنے نیک بندوں سے لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی مدرسے سے فارغ مستند عالم دین تو نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کا وہی کام لیا ہے جو اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے دین کی تجدید کے حوالے سے اپنے نیک بندوں سے لیتے رہے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

(باقی صفحہ 176 پر)

میرا ماں جایا — ڈاکٹر اسرار احمد

اقتدار احمد

جناب اقتدار احمد مرحوم (م ۱۹۹۵ء) کی یہ تحریر آج سے بیس برس قبل کی ہے جو انہوں نے اپنے ہفت روزہ جریدے ''ندا'' کی خصوصی اشاعت (۱۰/اپریل ۱۹۹۰ء) میں شائع کی تھی۔ اس تحریر کی ہر ہر سطر میں اپنے بڑے بھائی اور دینی قائد و رہنما ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے لیے والہانہ محبت و عقیدت کے جذبات شدت کے ساتھ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کی عظمت کے بیان میں یہ بے مثال یادگار تحریر خود لکھنے والے کی اپنی عظمت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

ایک ایسے بزرگ سے بے تکلف گفتگو ہو رہی تھی جو اپنی ذات میں خود انجمن ہیں' ادیب' صاحبِ قال و حال' عالمِ دین' دانشور' بے تحاشا لکھے پڑھے' ایک دنیا گھومے پھرے ہوئے' ہر شعبۂ زندگی کے رجالِ کبار سے رہ و رسم رکھنے والے اور باتوں باتوں میں مخاطب کا ''اندر'' باہر نکال لانے کے فن میں طاق۔ وہ میرا علمی حدود اربعہ اور ذخیرۂ مطالعہ و مشاہدہ کُرید رہے تھے اور میں اپنی جگہ خجل کہ ''کریدتے ہو جو یہ خاک' جستجو کیا ہے؟'' —— اپنے پاس تھا کیا جو وہ برآمد کرتے۔ آخر انہوں نے پوچھا۔ ''آپ اپنی زندگی میں سب سے بڑھ کر کس ہم عصر شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں؟'' اور میں نے بلا تامل جواب دیا: ''اپنے بھائی ڈاکٹر اسرار احمد سے''۔ ''یہ اُس شخص کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے''۔ انہوں نے بے ساختہ کہا اور پھر خاصی دیر ''بڑی بات ہے' بڑی بات ہے'' کا ورد کرنے کے بعد بتایا کہ وہ اہلِ دین میں سے بھی نمایاں' بہت نامور بزرگوں کو جانتے ہیں جن سے ایک دُنیا متاثر تھی اور ہے' لیکن ان کے قریب ترین لوگ' بھائی بہن' بیٹے بیٹیاں اور بہویں داماد کبھی کبھار مصلحت کے تحت کلمۂ خیر کہنے کے باوجود دلوں میں انہیں کسی اونچے مقام پر نہیں بٹھاتے۔ ''گھر کا جوگی جوگنا' باہر کا درویش'' اسی لیے ایک کہاوت بنی ہے' ایک ایسا اصول —— استثناء جس کی صداقت پر دلیل بنتا ہے۔

تنظیمِ اسلامی کے پندرہویں سالانہ اجتماع کی مناسبت سے مرتب کیے جانے والے ''ندا'' کے اس خاص شمارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات پر بہت کچھ لکھا جانا چاہیے تھا اور اس کی ضرورت بھی ظاہر ہے۔ جماعتوں اور تنظیموں میں اپنے قائد کی مدح وستائش' اس کی شخصیت کی سحر سازی اور image building پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنے چاروں طرف ہوتا کون نہیں دیکھ رہا' بلا ضرورت بھی اور حکمتِ عملی کے تحت بھی' شعوری کوشش کے ساتھ بھی اور لاشعوری جذبات سے مغلوب ہو کر بھی۔ وہاں یہ مطلوب ومحمود ہے یا نہیں' تنظیمِ اسلامی میں اس کے داعیٔ اوّل اور تاحیات امیر کی زندگی اپنے ساتھیوں کے لیے ایک کھلی کتاب ہونی چاہیے کیونکہ اس اسلامی انقلابی جماعت کے نظم کی اساس شخصی بیعت پر ہے' ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاتھ پر سمع وطاعت فی المعروف کی شخصی بیعت۔ چنانچہ وہ اپنے رفقاء کو تحریروں' تقریروں میں اپنے بارے میں حسبِ ضرورت اور اکثر صورتوں میں ضرورت سے زائد بھی بتاتے رہتے ہیں۔ اپنے ذہنی سفر کی داستان' دعوت رجوع الی القرآن کی تاریخ اور سنگ ہائے میل' اکابرین سے اثر پذیری اور ان کے اپنے ذاتی زندگی پر اثرات کی حکایت' اقامتِ دین کی دھن میں اس کے لیے جدّوجہد کے منہاج کی تلاش اور اپنے مراحلِ حیات سے اس کے ربط کی کہانی اور ان سب میں کسی خرقِ عادت بات' کسی کرامت کا ذکر نہیں ہوتا۔ کسی کشف کا اور رؤیائے صادقہ یا کاذبہ کا حوالہ نہیں ملتا' ایک عام آدمی پر گزرنے والی کیفیات سننے میں آتی ہیں —— ایک جویائے حق آدمی جسے اللہ نے محض توفیق سے نوازا ہے۔ ایک سالانہ اجتماع کی خصوصی نشست میں تو بات حد سے بڑھ گئی اور یہ بات زیادہ پرانی بھی نہیں' یہی کوئی دو تین سال پہلے کی ہے۔

یہ صلائے عام کی ایک مجلس تھی جو بالعموم تنظیمِ اسلامی کے اجتماعات کا ایک اہم حصہ ہوتی تھی جن میں رفقاء کو کہنے کی کھلی چھٹی ہوتی۔ وہ اپنی جماعت کی دعوت' طریق کار' اہداف اور نظم کے ذمہ داروں حتیٰ کہ امیرِ تنظیم کے بارے میں اپنے اشکالات اور اعتراضات پیش کرتے اور ان کے جواب پاتے تھے۔ ایک دو حضرات کی طرف سے مصرع اُٹھایا گیا کہ امیرِ محترم میں ''بزرگی'' کے آثار نظر نہیں آتے اور ''درویشی'' کا مظاہرہ بھی نہیں جو اسلامی انقلابی جماعت کے قائد میں بھرپور ہونا چاہیے۔ اختتامی تقریر میں ڈاکٹر اسرار احمد وضاحتیں کرتے ہوئے جب اس موضوع تک پہنچے تو اعلان کیا کہ میں فرائض کی حد تک تو مکلّف ہوں کہ ان کی ادائیگی کرتا

دکھائی دوں لیکن نفلی عبادات کے معاملے میں میں نے کبھی کوئی دعویٰ کیا نہ یہ خواہش رکھتا ہوں کہ آپ لوگ زیادہ خوش گمانی میں مبتلا ہوں۔ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے فرض عین میں اپنی جسم و جان اور دل و دماغ کی پوری صلاحیت کھپانے کو میں نفلی عبادات سے بہرحال افضل شمار کرتا ہوں۔ رہی بات درویشی کی تو اس سلسلے میں بھی عزیمت کا راستہ میں نے صرف اللہ کی توفیق سے حرام و حلال کے معاملے میں اختیار کیا ہے۔ دکھاوے کی سادگی میری طبیعت کے خلاف ہے اور بودوباش کی پختہ عادات سے بھی متصادم۔ تاہم حاضرین میں سے جو لوگ پسند کریں' میرے یہاں بیٹھے جا کر میرے گھر کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئیں اور میرے ٹھاٹھ باٹھ کا خود اندازہ کر لیں۔

حاضرین میں سے بہت سے اپنے امیر کے معیارِ زندگی کا ذاتی علم رکھتے تھے' کچھ کو شرم نے آگھیرا۔ پھر بھی کئی درجن پیرو جواں اُٹھے' تجسّس فطرتِ انسانی میں خود اللہ تعالیٰ نے ہی تو رکھا ہے۔ امیر محترم نے اپنے ایک بیٹے کو ساتھ کر دیا کہ خواتین کو صحن کے بیرونی راستے سے پڑوس میں بھیج کر اپنے ان ساتھیوں کو گھر کا چکر لگوا دے۔ مسجد کے ہال سے جہاں یہ نشست جاری تھی' باہر نکلے تو چند قدم پر قرآن اکیڈمی کے ''کوارٹروں'' کی وہ دومنزلہ قطار ہے جن میں سے دو انجمن خدام القرآن نے اپنے صدر مؤسس کو رہائش کے لیے کرایہ کے بغیر دے رکھے ہیں۔ رفقائے تنظیم کے گروہ نے ایک ایک کمرہ دیکھا' باورچی خانے اور غسل خانے تک میں جھانکا اور واپس آئے تو ان کے چہروں پر اطمینان اور خجالت کے ملے جلے تأثرات تھے۔ ان میں سے اکثر کے گھروں میں اپنے امیر کے دولت کدے سے بہتر اور وافر ساز و سامان تھا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہی دیکھتے اور بغیر کسی پیشگی ارادے کے ہوا۔ گویا ایک طرح کا ''چھاپہ'' تھا' خانہ تلاشی تھی جس میں سے ساتھیوں کے لیے سکینت برآمد ہوئی' کیونکہ ان کا امیر ایک سفید پوش غریب آدمی نکلا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی داستانِ حیات کو ان کی کتابوں' مطبوعہ تقاریر اور جرائد میں شائع ہونے والے متعدد انٹرویوز سے اخذ کر کے الگ سے مرتب کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ جب ضرورت ہوئی اللہ کا کوئی بندہ یہ کام ضرور کرے گا' لیکن میرے پیشِ نظر اس وقت ان کی سوانح لکھنا نہیں' اپنے بھائی کی شخصیت کے وہ پہلو دکھانا ہے جن تک ایک ماں جائے کی نگاہوں کی ہی رسائی ہو سکتی ہے۔ ان کی زندگی کے بعض گوشوں سے ان کے رفقائے کار مجھ سے بہتر واقف

ہوں گے' وہ ان کے ساتھ کام جو کرتے رہے ہیں۔ ان کے اثرات مجھ سے کہیں زیادہ قبول کرنے والوں کی بھی کمی نہیں' لیکن میرا بھائی ..... بابو بھائی' دوسرے تین بھائیوں اور چار بہنوں کے مقابلے میں میری زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا۔ وہ حصار (ہریانہ۔ بھارت) میں اپنے والدین کے اُس گھر میں پیدا ہوئے جو ریلوے سٹیشن کے قریب واقع تھا اور جہاں ہم پس ماندہ مسلمانوں کی نظروں میں ریل کے بابو بہت معزز اور بڑے ہی قابل رشک سمجھتے جاتے۔ وہ اپنے سے بڑی بہن کے اگلے نمبر پر ایک بھائی کے کم سنی میں انتقال کے بعد پیدا ہوئے اور ان کی کٹوروں جیسی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی لہٰذا بابو کہلانے لگے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو سب سے بڑے بھائی مجھ سے دس برس بڑے ہونے کے باعث تعلیم کی اگلی منزلیں طے کرنے کے لیے دو سو میل دور لاہور میں مقیم تھے اور والد صاحب مرحوم و مغفور ضلع کچہری کے نامور ترین قابل و محنتی اہل کار 'دیوان جی' ہونے کے ناطے اپنے کام میں بے طرح مصروف۔ میرا واسطہ اپنے سے چار سال بڑے بابو بھائی سے پڑا۔

آج کہتا ہوں کہ میں اپنی عمر سے کم از کم دس برس بڑا ہوں' بچپنے میں بھی یہ بات اتنی ہی درست تھی۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد متوسط طبقے کے درمیانی بلکہ زیریں پرت میں بھی زیادہ نہ تھی' اور یہ لوگ بھی اس مخلوط معاشرے میں باعزت سمجھے جاتے لیکن اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کو ان معزز تر مسلمان اہل کاروں کو کیا پاپڑ نہ بیلنے پڑتے ہوں گے' اس کا اندازہ لگانا اب آسان نہیں رہا۔ ایسے ہی ایک سفید پوش اہل کار گھرانے میں نویں بچے کی پیدائش پر کتنی خوشی منائی گئی ہوگی جن میں اجل کی نقب زنی کے بعد چھ بقید حیات تھے اور دو سال بعد جن میں ساتویں کا اضافہ تقریباً یقینی۔ والدین نے واجبی توجہ اور محبت ضرور دی ہوگی لیکن روایتی لاڈ پیار سے محرومی اور اس پر مستزاد دل و دماغ کی زود حسی نے مجھے الجھا کے رکھ دیا اور خوب یاد ہے کہ میں بہت چھوٹی عمر میں بڑی بڑی باتیں سوچنے لگا تھا..... لایعنی اور بے حقیقت باتیں' جن کا کوئی سرا کبھی میرے ہاتھ نہ لگتا۔ ستم بالائے ستم بابو بھائی کی سرپرستی جو مجھ سے کہیں زیادہ خوش نصیب تھے کہ پانچویں نمبر پر ایک بیٹے کے گود خالی کرنے کے بعد پیدا ہوئے اور دادا ابا کی فراغت و فرصت اور شفقت سے بھی جی بھر کے فائدہ اُٹھا چکے تھے۔ اپنے محسوسات کے بوجھ تلے جھکی ایک کچی شاخ پر بھاری بھرکم اور پُر اعتماد شخصیت رکھنے والے بڑے بھائی کی نگرانی کا اضافی بار یعنی مرے پہ سَو دُرّے۔ ''سگ باش برادر خورد مباش'' کسی میرے جیسے

دل جلے کی زبان سے نکلا ہوگا۔ انہوں نے تعلیم و تربیت کی غرض سے مجھ پر سختی روا رکھی یا اپنی بزرگی کا خراج وصول کیا' اللہ ہی جانے' میں تو اتنا جانتا ہوں کہ میرے خالق سبحانہٗ وتعالیٰ نے جو طبعی کمزوریاں آزمائش کے لیے میرے کھاتے میں ڈال کر مجھے دنیا میں بھیجا تھا ان میں اِس ''حسنِ سلوک'' سے سہ چند اضافہ ہوگیا اور وہ گویا میری سرشت کا حصہ بن کر رہ گئیں۔

یوں تنظیم اسلامی کے امیر محترم ان بشری خامیوں اور طبعی کوتاہیوں کی ذمہ داری میں حصّہ دار ہیں جن سے میں اب تک گلو خلاصی نہیں کرا سکا' شاید مرتے دم تک جان نہ چھڑا سکوں۔ انہوں نے بعد میں اپنے قصور کی تلافی کر دی' جو بے شمار نیکیاں مجھ سے کیں ان میں سے ایک ہی عنداللہ میرے باب میں ان کے سب گناہوں کا کفّارہ بن جائے گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے (جی ہاں' اُس وقت تک وہ ایم بی بی ایس کر چکے تھے) تجویز کیا کہ اس نیم تعلیم یافتہ' بے روزگار' آشفتہ حال نوجوان کی وحشت کا مداوا شادی میں ہے۔ والدین' بھائی' بہن اور عزیز و اقارب سب اس بے تکی بات پر انگشت بدنداں تھے کہ یہ تو ڈوبا ہے' ایک اور جان کو اس کے ساتھ کیوں ڈبویا جائے۔ تاہم انہوں نے ساری مخالفت کے علی الرغم اور آٹھ دس جگہوں سے رشتے کے سوال پر ٹکا سا جواب ملنے پر بھی میرے لیے ایک عدد مناسب و موزوں بیوی کی تلاش جاری رکھی اور ٹھیک بیس سال کی عمر میں میرا گھر آباد کر دیا۔ یہ نہ ہوا ہوتا تو میں کبھی کا مرکھپ گیا ہوتا' کیونکہ مجھ میں وہ ڈھیٹ ہڈی موجود نہ تھی جو رشتے میں ہمارے ایک قریبی عزیز کی شکل میں جو عمر میں مجھ سے بڑے ہیں' آج بھی زمین کا بوجھ ہے۔ انہیں دیکھتا ہوں تو ڈاکٹر اسرار احمد کے اسی ایک احسان کا کوہِ گراں میری کمر کو دوہرا کر دیتا ہے۔

میرے تنظیمی بھائی پریشان نہ ہوں' میں ان کے امیر کی زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بہانے اپنی رام کہانی سنانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا' بس مقطع سے بہت پہلے مطلع میں ہی سخن گسترانہ بات آ پڑی۔ ویسے بھی اگر انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کو فرشتہ سمجھا تو بہت غلط کیا۔ وہ ایک عام انسان کی طرح اسی معاشرے میں پلے بڑھے ہیں۔ بشری کمزوریوں سے وہ ہرگز مبرّا نہیں' نہ اس کا دعویٰ کبھی انہوں نے کیا۔ ہاں قسّامِ ازل نے اپنے فضلِ خاص سے انہیں یہ ملکہ ضرور عطا کیا ہے کہ خامیوں کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیں اور خوبیوں کو حکمتِ قرآنی کے زیور سے آراستہ کرتے چلے جائیں۔ کیا ہم اپنے ربّ کی خلاّقی کا یہ کمال نہیں دیکھتے کہ ایک ہی وقت میں روئے ارضی پر رہتے بستے اربوں انسانوں میں ایک شکل وصورت' ایک قد بُت اور

ایک سی عادات واطوار رکھنے والے دو انسانوں کو دریافت کر لینا عجائباتِ دُنیا میں شمار ہوتا ہے۔ ایک ماں جائے پانچ بھائی ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور ہر ایک جدا جدا ''شاکلہ'' رکھتا ہو تو اس میں تعجب کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ میں ان میں منجھلا ہوں اور شاید اسی لیے جامع الصفات بھی ہوں' میری ذات میں دونوں بڑے اور دونوں چھوٹے بھائیوں کے خصائص کا عکس موجود ہے.....لیکن بس عکس ہی اور عکس بھی ایسا جسے احوال وظروف کے موجزن پانی کی سطح پر جوار بھاٹے نے مسخ کر کے رکھ دیا' چنانچہ اب اپنے بھائی ڈاکٹر اسرار احمد کے کردار کی رفعت کو نگاہوں میں سمیٹنے کے لیے مجھے اپنی ٹوپی سنبھالنی پڑتی ہے۔ لِلہ کوئی صاحب میرے حال کے گزسے ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت کو ماپنے نہ بیٹھ جائیں۔

ان کے کردار کی اس رفعت کا راز کیا ہے؟ ایک اور صرف ایک — انہوں نے اللہ کی کتابِ ہدایت سے ناطہ جوڑ لیا تھا۔ یہ کیسے ہوا' قرآن حکیم سے قلبی وذہنی تعلق قائم کرنے میں کن عوامل نے کام کیا' حکمتِ قرآنی کے فیض کا اکتساب انہیں کون سی شخصیات کے ذریعہ ہوا اور اس سلسلے میں وہ کس کس کے کتنے کتنے ممنون احسان ہیں' ان موضوعات پر انہوں نے خود ہی بہت روشنی ڈالی ہے اور انہیں سننے پڑھنے والے رفقائے تنظیم ان سب تفاصیل سے خوب واقف ہیں۔ انہیں جو کچھ حاصل ہوا' انہی مطبوعہ حروفِ قرآنی سے ہوا جو آپ اور ہم تلاوت کرتے ہیں اور میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ انہیں موسیقی سے شغف تھا جسے انہوں نے قرآن مجید کی قراءت کی طرف موڑ دیا' انہیں شعروادب کا ذوق تھا جس کی بھرپور تسکین اللہ کے پُرشکوہ کلام سے ہوئی' انہیں اللہ نے ذہانت وفطانت سے نوازا تھا جسے انہوں نے فہمِ قرآن میں استعمال کیا' وہ انسانی نفسیات سے دلچسپی رکھتے تھے' چنانچہ انسانوں کے خالق نے اپنی کتاب میں اپنے بندوں کی جو تحلیلِ نفسی کی وہ ان کے دل میں گھر کر گئی' وہ علم الابدان کا مطالعہ کر چکے تھے' قرآن مجید نے جس کی توثیق کی' انہیں مخاطبین کو اپنی تقریروں سے مسحور کر دینے کا ملکہ حاصل تھا جسے قرآن کے انقلابی فکر' دندان شکن استدلال اور مسحور کن خطابت نے صیقل کیا اور وہ ہر اچھی سنی پڑھی بات کو یادداشت میں محفوظ رکھ سکنے کی صلاحیت رکھتے تھے جس میں انہوں نے قرآن کے چیدہ چیدہ حصے حفظ کر کے اور برکت ڈالی۔ یہ پورا عمل خالص انسانی سطح پر ہوا' جس میں کوئی غیبی اشارہ' کوئی روحانی برتری' کوئی کشف وکرامت غرض کسی بھی مافوق الفطرت بات کا دخل نہ تھا اور اس عمل (process) سے گزرتے میں نے خود انہیں دیکھا ہے۔

مجھے پندرہ سال پہلے زعیم مصری جمال عبدالناصر کے دینی مزاج رکھنے والے جنرل سعید قادر یعنی فوج کے کیو ایم جی اور بعدہ وزیر پیداوار' جنرل فتحی رزق نے جدہ میں میرے بھائی کی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا خوبصورت عربی ترجمہ پڑھنے کے بعد یہ کہہ کر چونکا تو دیا تھا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کتاب کو لکھنے والا شخص کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا'' تاہم حضور نبی اکرم ﷺ کی ایک طویل حدیث کا مفہوم جب سامنے آیا جس میں اسی بات کی طرف جامع اور شاندار اشارہ ملتا ہے تو میری حیرت دور ہوگئی۔ میں نے بچشم سر دیکھا کہ قرآن حکیم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والا یہ شخص' میرا بھائی اپنا ہر خیال' ہر جذبہ' ہر مایوسی کا مداوا اور ہر کامرانی پر عجز و سپاس کے اظہار کا قرینہ اسی کتاب سے مستعار لیتا ہے —— اور میں نے بچھونا کہہ کر کہیں قرآن کریم کی توہین تو نہیں کی! نہیں' خود اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ایک حدیث قدسی کے مطابق جب اپنے مؤمن بندے کے پاؤں بھی بن جاتے ہیں جن سے وہ چلتا ہے' تو کلام اللہ کو بچھونا کہہ دینے میں کیا حرج۔

وہ معاملات کی سوجھ بوجھ رکھنے اور انتظامی امور سے نپٹنے میں ہم پانچوں بھائیوں میں سب سے آگے ہیں۔ خاندانی معاملات میں بھی ان کی رائے کو ہمیشہ فوقیت دی گئی۔ اس باب میں کم تر قابلیت رکھنے والے ہم تین بھائی لاکھوں بلکہ کروڑوں میں کھیلے' چوتھے کو استثناء اس لیے ہے کہ اس نے تعلیم و تعلّم کو پیشہ بنایا ہے جس میں کمائی کے مواقع محدود ہوتے ہیں' لیکن ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی خصوصی صلاحیت اور خداداد ذہانت کو بھی دنیا بنانے میں نہیں بلکہ ہر سطح پر دین کے کام میں کھپایا۔ ان کے خود اپنے پیشے (یعنی ڈاکٹری جس میں بہت جلد مشہور ہوگیا کہ ان کے ہاتھ میں شفا ہے) یا ہمارے کاروبار (جس میں انہیں دو بار شریک کیا گیا) یا سیاست (جس کے مواقع انہیں ہر زمانے میں ملتے رہے) کے میدان کھلے پڑے تھے' جتنا چاہتے تاخت و تاراج کرتے' آگے سے آگے بڑھتے چلے جاتے' لیکن انہوں نے شعوری طور پر اور خود اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اپنی پوری ذہنی و جسمانی توانائی دعوت رجوع الی القرآن اور قرآن کی انقلابی دعوت پھیلانے میں جھونک دی۔ ان میں کم و بیش وہ سب وہبی خامیاں بھی یقیناً موجود تھیں جو باقی آٹھ بہن بھائیوں میں پائی جاتی ہیں' ان کی جھلکیاں کبھی کبھار نظر بھی آتی ہیں لیکن ان عیوب کو حکمتِ قرآنی اور سیرتِ مطہرہ سے شغف کے فیض نے گویا ڈھانپ لیا ہے۔ قربان جایئے' کیسی ستار العیوبی ہے یہ بھی۔ حقیقت یہ ہے اور اس کی

طرف قرآن وحدیث میں واضح اشارے بھی ملتے ہیں کہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ حکمتِ قرآنی سے نواز دے' اس سے بڑا دولت مند کوئی نہیں ہوسکتا اور جسے اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے نقوش رہنمائی و دست گیری کے لیے مل جائیں' اُس انسانِ عظیم کے نقوشِ قدم جس نے معصوم عن الخطا اور اللہ کا برگزیدہ ترین بندہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کے درمیان خالص انسانی سطح پر زندگی گزار کر دکھائی' اس سے بڑا غنی کون!

وہ ہم سب بھائیوں میں سب سے زیادہ باذوق شخص تھے۔ اچھا کھانے' اچھا پہننے' اچھی چیزیں استعمال کرنے اور اچھی سے اچھی گاڑی رکھنے' اس میں بیٹھنے بلکہ اسے تیز سے تیز دوڑانے میں سب سے آگے تھے' لیکن ایک مقصد کی لگن نے ان کے ذوق وشوق کی واحد سمت کو متعین کر دیا ہے۔ خوش ذوقی آج بھی موجود ہے' حسن ترتیب رخصت نہیں ہوا' خوب سے خوب تر کی تلاش موقوف نہیں ہوئی' تیز گامی بھی ترک نہیں کی لیکن اُن کی تسکین اب قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے حسن انتظام' کتابوں اور جرائد کی خوبصورت طباعت واشاعت اور قافلۂ تنظیمِ اسلامی کی حُدی خوانی میں ہوتی ہے۔ یہاں کور ذوقی' بے ترتیبی اور ماحضر و ماتیسر منہ پر قناعت انہیں بُری طرح کھلتی ہے' غصہ آئے تو انہی باتوں پر آتا ہے' اُلجھن انہی سے ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد اور میرے درمیان ایک حجاب اور بُعد کی کیفیت بھی کچھ دنوں برقرار رہی لیکن اس کا دورانیہ زیادہ طویل نہیں۔ مجھے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کیے تو چھ سات سال سے زیادہ نہیں ہوئے' لیکن مرکزی انجمن خدام القرآن کے مؤسسین کی فہرست میں میرا نمبر پہلا ہے تو اگرچہ بظاہر اس کا سبب حروف تہجی کی ترتیب بنی تاہم سچ یہ ہے کہ ''گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار' لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا''۔ میں باقی سب بھائی بہنوں کے مقابلے میں ذہنی طور پر ان سے قریب تر اور عمل کے اعتبار سے شاید سب سے دور رہا ہوں۔ دروغ بر گردنِ راوی' انہوں نے ایک موقع پر اپنے خاص رفقاء کی کسی محفل میں مجھے اپنے مشن کے لیے کسی نسبت وتناسب کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہہ دی۔ بڑے بھائی اللہ کے رسول تھے اور چھوٹے نبی' یہاں نہ وہ رسول ہیں نہ مجھ میں نبوت کا کسی درجے میں کوئی احتمال۔ ہاں کارِ رسالت کو جو ختم نبوت کے بعد ہر اُمتی کی ذمہ داری بن گیا' وہ خود تو اللہ کی تائید وتوفیق سے نبھا رہے ہیں' اپنے بارے میں کیا کہوں۔ ''من آنم کہ من دانم''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑ لی تھی کہ میں طُور پر تورات وصول کرنے گیا تو تم کیا سوئے رہے تھے جو سامری نے بچھڑے کا مجسمہ بنا کر اپنے جادو کے زور سے اس میں جان ڈالی اور میری اُمت کو اس کی پوجا پر لگا لیا' میرے موسیٰ کو یہ خبر ہو بھی گئی ہو کہ اس کے ہارون نے خود اپنے دل میں تین سو ساٹھ بُت سجا رکھے ہیں تب بھی ان کا ہاتھ میری داڑھی پر نہیں پڑا کہ میرا صنم کدہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا اور انہیں علم غیب تو کیا کشف و القاء کا بھی دعویٰ نہیں۔ میرے ظاہر کے باطن کو خداداد بصیرت کی آنکھ سے دیکھتے بھی ہوں تو چشم پوشی کی سنت پر عمل پیرا ہیں۔ کیا عجب میری نابکاری کو بھی ان کی کریمی سے شرم آ ہی جائے' کوئی ایسی صبح مجھ پر بھی طلوع ہو تو سکتی ہے جب میرے خوابیدہ قوائے عمل انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھیں۔ اے اللہ مجھ پر رحم فرما' اس صبح کے نور سے میری دنیا کو بھی منور کر دے —— رَبِّ وَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی۔

اپنے زمانے کے داعیانِ حق اور کبارِ رجالِ دین کی طرف اشارہ نہیں کرتا' لوگ خود ہی موازنہ کر لیں۔ میرے بھائی کو بہر حال اللہ تعالیٰ نے جس فضیلت سے نوازا وہ میری تو آنکھیں کھول دینے کو کافی تھا اور آج تک ہے۔ انہوں نے اپنے اہل خانہ کو اپنی اوّلین دینی ذمہ داری سمجھا اور پھر قریب ترین عزیزوں کے دلوں پر جا کر دستک دی۔ اپنی اولاد کو ہمہ تن دین کی خدمت میں لگانے کے بعد قرآن اکیڈمی میں دین کی بنیادی تعلیم' عربی کی ضروری تحصیل اور قرآن مجید سے ذہنی رشتہ استوار کرنے کا ایک دو سالہ نصاب جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے شروع کیا تو مجھ سے کہا: ''اقتدار میں لوگوں سے ان کے لال کس منہ سے مانگوں اگر تم بھی اپنے بیٹوں کی زکوٰۃ نہ نکالو!'' —— میرے چار بیٹوں میں سے ایک بہت چھوٹا تھا اور ایک میٹرک کی تیاری میں' گویا یہ دونوں تو دو سالہ کورس میں داخلے کی اہلیت ہی نہ رکھتے تھے۔ بڑے دونوں تعلیم سے فراغت کے بعد کاروبار میں میرے دست و بازو بنے ہی تھے کہ یہ مطالبہ سامنے آ گیا۔ ''ان میں سے چھوٹا مجھے دے دو' وہ نسبتاً زیادہ ذہین و فطین ہے''۔ انہوں نے میرے چمن کے سب سے خوبصورت پھول کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا جو پیش کر دیا گیا۔ وہی پھول اللہ تعالیٰ کو بھی پسند آیا اور پہلے سال کی تکمیل کے بعد دوسرے سال کی کلاسز attend کرتے ہوئے عین عالمِ شباب میں شاخ سے توڑ لیا گیا۔ ہفتہ کے روز کلاس کا وقت شروع ہونے سے پہلے وہ نفسِ مطمئنہ اپنے ربّ کی طرف لوٹ گیا' جمعہ کو چھٹی تھی اور جمعرات کی

کلاس وہ پڑھ کر گیا تھا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۶ء کی سہ پہر مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرا بیٹا احمد اور داماد (جو حقیقی بھانجا بھی تھا) عبداللہ طاہر دونوں بیک وقت لاہور سے دوسو میل دور سڑک کے اچانک حادثے میں دم توڑ گئے تھے۔ میرالخت جگر احمد ڈاکٹر اسرار احمد کا داماد اور ان کی اکیڈمی کا ایک ہونہار طالب علم بھی تھا اور طاہر بھی ان کا حقیقی بھانجا اور پڑوسی' جس سے انہیں خیر کثیر کی توقع تھی۔ میری ڈھارس بندھانے کو وہ بھی دوسرے اعزّہ واقارب کی طرح میرے گھر آ گئے جس کی فضا پر غم و اندوہ کے سیاہ بادل سایہ فگن تھے۔ باہر کے بڑے مردانہ کمرے میں عصر کی نماز ان کی اقتدا میں باجماعت پڑھی گئی جس کے بعد دعائیں حسب حال تھیں۔ ہمیں وہ شام اور پوری شب اپنے نوجوانوں کے کچلے ہوئے جسموں کا انتظار کرتے آنکھوں میں کاٹنی تھی۔

مغرب کی جہری نماز میں انہوں نے قرآن مجید سے چنیدہ حصے ملکوتی ترنم اور گہرے تأثر کے ساتھ پڑھے جو ان کی قلبی کیفیت کے آئینہ دار تو تھے ہی' میری قرآنی عربی میں تھوڑی بہت شُدبد بھی کام آ گئی۔ آنکھیں بہتی رہیں لیکن دل کو قرار آ گیا۔ ایسی سکینت طبیعت پر طاری ہوئی جو دو عالم کی متاع دامن میں بھر کر حاصل نہ ہوتی۔ دعاؤں نے کچھ اور ڈھارس بندھائی' لیکن عشاء کی نماز تک ضبط کے بندھن پھر ٹوٹ گئے تو میرے ڈاکٹر بھائی نے دوا کی ایک اور خوراک نکالی۔ عشاء کی طویل تر قراءتوں میں انہوں نے قرآن کریم کے کچھ اور حصے منتخب کیے۔ زندگی اور موت کا فلسفہ' فکر انسانی کی نارسائی' حقیقتِ اشیاء' مصائبِ دُنیوی پر صبر کا عقبیٰ میں انعام' ان بچوں کی موت کی نوعیت جو خود ان کے لیے اور والدین کے لیے توشۂ آخرت بن سکتی تھی جیسے موضوعات پر کلام الٰہی کے جادو نے زخموں پر پھر پھاہے کا کام کیا۔ رات بھر انگاروں پر لوٹتے رہنے کے بعد فجر کی نماز میں صبر و مصابرت کا اعلیٰ ترین قرآنی درس دوبارہ دیا جب ہمارے مسلے ہوئے پھول گھر پہنچ کر دلوں میں کرب والم کی کرچیاں بہت گہرائی تک پیوست کر چکے تھے۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز تو تھا ہی لیکن کیا اس میں سے حسب موقع ومحل مخصوص حصے تلاش کر کے مرہم کی طرح استعمال کرنے والے ڈاکٹر کی تشخیص وتجویز کا کوئی کمال نہ تھا؟ کیا اقبال نے مؤمن کی شان یہی بیان نہیں کی کہ ''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن''۔ بچوں کی تکفین وتدفین کا مرحلہ بھی مجھ پر تو ایک بھیانک خواب کی طرح گزرا لیکن ڈاکٹر صاحب نے جس عزیمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اطمینان وسکون کے ساتھ خود بڑھ کر اس کی تکمیل کی' اس نے سینکڑوں

دیکھنے والوں کو ہلا کر رکھ دیا' یا یوں کہیے کہ دین اور ایک دیندار کی عظمت ذہنوں پر نقش کر دی۔

اس سے بہت پہلے ہمارے پھوپھی زاد بھائی' شیخ نصیر احمد (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) سرطان کی سرجری کے دوران انتقال کر گئے تھے۔ ان کی نماز جنازہ میانی صاحب کی جنازگاہ میں میرے بھائی ڈاکٹر اسرار احمد نے پڑھائی۔ ان کی میت کے ساتھ کھڑے ہو کر پہلے حاضرین سے مختصر خطاب کیا' پھر نماز سے پہلے مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کی' خالص ذاتی درخواست کے ساتھ تاکید و ترغیب کے چند کلمات ادا کیے اور کہا کہ ان کی کسی بھلائی کا بدلہ آپ اب اسی شکل میں دے سکتے ہیں' اپنے اسی آخری انجام کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی کسی برائی کو معاف کر کے احسان کرنے کا یہی موقعہ ہے تو غیر متعلق حاضرین کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ کیا قاری کو یہ حقیقت تسلیم کرنے میں تأمل ہوگا کہ میرے دل میں اک ہوک سی اُٹھی تھی' کاش اس چارپائی پر استراحت کرتا یہ سفید پوش شخص بھائی نصیر نہ ہوتے' میں خود ہوتا۔ بعد میں بھی ان کی اقتدا میں کوئی بھی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد دل سے دُعا نکلتی ہے کہ میرا خاتمہ بالخیر اپنے بھائی کی حیات میں ہو۔ کیا عجب ان کے ہاتھوں تجہیز و تدفین میرے بھی کسی کام آ جائے۔ اللہ انہیں عمر خضر عطا فرمائے اور ان پر وہی دھن سوار رکھے جو تا حال ان کے دل و دماغ پر مستولی ہے۔

کیا اپنے مقصدِ حیات یا آئیڈیل سے خلوص کی پیمائش کا کوئی پیمانہ دنیا میں بھی موجود ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ دوسروں کی بات کیوں کروں' ہم تین بھائیوں نے اپنی زندگی کی توانائیوں کا ایندھن پیٹ کے جس بھاڑ کو گرم کرنے اور گرم رکھنے میں پھونکا اسی میں اپنے بیٹوں کو بھی جھونک دیا ہے' چوتھے بھی شاید ایسا ہی کوئی کام دکھائیں۔ اور کیا میرے بھائی اسرار نے بھی یہی' لیکن اپنی اولاد کو ایک مختلف بھاڑے پہ لگایا۔ ان کے تین بیٹے دین کے اسی مشن میں شریک ہیں جس کی دعوت دیتے باپ نے انگریزی محاورے کے مطابق اپنی موم بتی کے دونوں سروں کو آگ دکھائے رکھی اور آخری چوتھا ابھی چھوٹا ہے لیکن بچ کر جائے گا کہاں؟☆۔ بڑے تینوں بیٹے اہل و عیال والے ہیں۔ پہلے بیٹے کی شادی ڈاکٹر بھائی

☆ واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۹۰ء کی ہے۔ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کا چھوٹا بیٹا بھی ان کے مشن میں ہمہ وجوہ شریک ہے۔

نے تنظیم اسلامی میں اپنے رفیق خاص کی صاحب زادی سے کی اور مطلوب دینی رشتے کو دنیوی تعلق سے گرہ دے کر مضبوط کرنا تھا..... باقی دو بیٹے میرے داماد ہیں اور اس لیے ہیں کہ ''ہارون'' کی بیٹیاں ''موسیٰ'' نہ لے گا تو کون لے گا اور اس میں تعلّی محسوس ہو تو یوں کہیے کہ ''کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد''۔

اپنے جگر کی ٹھنڈک بیٹیوں کو لوگ اچھی سے اچھی جگہ بیاہتے ہیں کہ سکھ پائیں، عیش دیکھیں، راج کریں..... ڈاکٹر اسرار احمد کی پہلی بیٹی کے لیے اچھرہ میں تین مرلے کے ایک گھر کے مکین اہل حدیث خاندان سے رشتہ آیا جس میں میری بھابھی کی ایک بھتیجی کچھ پہلے سے رونق افروز تھی۔ والد وفات پا چکے تھے، چنانچہ دونوں بھائی خود چل کر قرآن اکیڈمی میں ڈاکٹر صاحب کے گھر سوال لائے۔ بڑے گویا بھتیجے داماد تھے اور چھوٹے امیدوار۔ کہا گیا کہ آپ ماشاء اللہ دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے اور نماز روزے کے پابند ہیں لہٰذا کوئی اور تفصیل درکار نہیں، لیکن ڈاکٹر اسرار کا داماد داڑھی کے بغیر ہو، بات کچھ جچتی نہیں۔ دونوں بھائی خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے اور ایک ماہ بعد دوبارہ آئے تو دونوں کے چہروں پر سنت رسول ﷺ بہار دکھا رہی تھی۔ بات بن گئی کیونکہ کوئی اور کھود کرید کی ہی نہیں گئی تھی اور واحد شرط ایک چھوڑ، دونوں نے پوری کر دی۔ بعد میں اس داماد نے بیعت کی اور اب تنظیم کے سرگرم ذمہ دار رفقاء میں سے ہے۔ دوسری بیٹی تنظیم اسلامی کے ایک نمایاں رفیق کے چھوٹے سے گھر گئی جس نے دانتوں کی سرجری میں تعلیم کے دوران ہی تنظیم کے قریب آنا شروع کر دیا تھا اور شادی کے بعد کٹھن مراحل سے گزر کر جن میں دو سالہ کورس کی تکمیل بھی شامل ہے اور جماعت میں درجہ بدرجہ اوپر اٹھتے اٹھتے اب جماعتی نظم میں پاکستان کی سطح پر امیر تنظیم کے بعد سب سے بوجھل ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اُٹھا رکھی ہے۔ یہ دونوں داماد ذات برادری اور خاندانی پس منظر کے اعتبار سے ہمارے لیے بالکل اجنبی اور دُنیوی جاہ وحشمت میں ہمارے گھرانے کی حیثیت کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ اب دین میں وہ کم از کم مجھ سے بہت، بہت زیادہ بلند ہیں۔

میرے بھائی کی دو بیٹیاں دلہن بن کر میرے گھر اُتریں اور میرے گھرانے کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے..... اللہ سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہوگا کہ ان دو رشتوں کی بنیاد بھی دنیاوی رکھ رکھاؤ اور بھائی چارہ نہیں، دین کی چاہت تھی۔ اب میرے احاطہ میں شرعی پردے کے تقاضوں کو پورا کرنے

کے لیے تین خاندان چار ایسے گھروں میں مقیم ہیں جو بالکل الگ الگ ہوتے ہوئے بھی باہم دگر جڑے ہوئے ہیں —— ایک میں چار اور چار میں ایک کی اچھوتی مثال۔ کسی نے دنیا میں جنت کے امن وسکون اور راحت کا نظارہ کرنا ہو تو صلائے عام ہے۔ اس باغ کی یہ بہار میرے بھائی کی مرہونِ منت ہے۔ اے اللہ میرے اس چمن کو اسی طرح آباد رکھیو اور مجھے اپنی جنت کے باغوں سے اس وجہ سے بے دخل نہ کیجیو کہ تو دنیا میں بہت سیر دیکھ آیا ہے۔ حق نہ کوئی رکھتا ہوں نہ کبھی جتا سکوں گا' رحم اور کرم کا امیدوار ہوں۔ تو میرے ان پھولوں جیسے پوتے پوتیوں کی اپنے دادا ابا کے حق میں سفارش تو ضرور سنے گا جن کے معصوم دل ودماغ میں تو نے ہی اپنے فضل خاص سے خیر وشر کا امتیاز پیدا کرنے کا سامان کیا۔ ابھی چند دنوں پہلے انہی میں سے ایک' میری پانچ سال سے بھی کم عمر پوتی اور ڈاکٹر صاحب کی نواسی وَردہ نے ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے دیکھ کر میرے گلے میں اپنی ننھی بانہیں ڈالتے ہوئے ٹھٹک کر کہا تھا: ''دادا ابا آپ گانے سن رہے ہیں' اللہ میاں گناہ دے گا''۔ ''چندا' تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''۔ ''امی نے بتایا ہے' اللہ میاں گناہ دیتے ہیں''۔ ''بیٹے گناہ سے ہوتا کیا ہے؟''۔ ''دادا ابا' گناہ بُری بات ہوتی ہے' اللہ میاں آگ میں ڈال دیتے ہیں!''۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک اور نواسہ' میرا ساڑھے تین سالہ پوتا' عمر اپنی کسی بات کی تردید پر تلملا اُٹھتا ہے: ''دادا ابا میں سچ بولتا ہوں' جھوٹ نہیں کہتا.....''۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی اولاد کی نو شادیاں قرآن اکیڈمی کے اپنے کوارٹر میں بیٹھ کر کیں۔ نکاح مسجد میں اور فرشی ولیمے قرآن اکیڈمی کی خانقاہ میں۔ ایسی ایک شادی دیکھ کر مشہور مسلم لیگی اور بزرگ صحافی جناب م ش نے نوائے وقت کے اپنے کالم میں اس کی تفصیل بیان کی اور حیرت کے اظہار کے ساتھ اپنے تأثرات قلم بند کرتے ہوئے عنوان جمایا کہ ''ایک اونس عمل ایک ٹن وعظ سے بھاری ہوتا ہے''—— کسی میں شریک ہو کر بڑے بڑے دنیا دار سیٹھوں کی پلکیں بھیگ گئیں اور ان کے بیٹے میری بیٹی کے ایک نکاح میں شامل ہونے کے بعد جونیجو کابینہ کے ایک وفاقی وزیر عش عش کر اُٹھے جو مجھ سے ذاتی تعلق کی بنا پر جمعہ کے لیے مسجد دارالسلام باغ جناح میں تشریف لا کر ایسا تماشا زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے تھے اور اگلے روز سادہ فرشی ولیمے کی دعوت میں جنہوں نے اپنے بڑے صاحب زادے کو اس معذرت کے ساتھ بھیجا کہ انہیں خود ایک سرکاری مصروفیت کے باعث اچانک اسلام آباد جانا پڑ گیا ہے۔

میرے ڈاکٹر بھائی کی بیٹیاں ذہانت وقابلیت میں کسی سے کم نہ تھیں' ہو بھی کیسے سکتی تھیں اور باپ بھی ایسا گیا گزرا نہ تھا کہ انہیں لاہور کالج فار ویمن میں تعلیم نہ دلا سکتا' فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں داخلے کا انتظام نہ کر سکتا' لیکن پہلی تین چار جماعتوں کے بعد کسی نے سکول کالج کا منہ نہ دیکھا' بلکہ ایک دو تو اس ''اعلیٰ تعلیم'' سے بھی محروم رہ گئیں۔ وہ تعلیم نسواں کی ضرورت کے قائل ہیں۔ ''تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر' خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں''۔ اور کسے معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں سکولوں کالجوں کا حال کیا ہے' ماضی قریب میں اسلام کا انقلابی تصور دینے والے ہمارے ایک قابلِ احترام بزرگ نے انگریز کے زمانے میں انہیں قتل گاہیں قرار دیا تھا۔ کیا حقیقت یہ نہیں کہ اُس وقت ہمارے بچوں کا دین واخلاق ان تعلیمی اداروں میں ذبح ہوتا تھا تو مادر پدر آزادی کے بعد اب وہاں ہماری قدروں کا جھٹکا کیا جاتا ہے۔ چار بچیوں نے اپنے طور پر پڑھ کر ایف اے پاس کیا اور گھر بار کی ہوگئیں' تاہم پانچویں کم سنی میں شادی ہو جانے کے باعث میٹرک سے بھی آگے نہ جا سکی۔ امتحانات کی مختصر تیاری کے لیے ان کے دادا کی عمر کے ایک قابل اعتماد دیندار استاد کا احسان مول لیا گیا جن کے سامنے گھر کے بیرونی کمرے میں یہ بچیاں پورا برقعہ اوڑھ کر بیٹھتیں جو آنکھوں کے سوا پورے جسم کا ساتر ہوتا۔ الحمدللہ کہ میری بھی پانچ ہی بچیاں اسی طرح ''فارغ التحصیل'' ہوئیں اور ہو رہی ہیں' البتہ اس مشترکہ اہتمام کے خاتمے یعنی میری بچیوں کے کم عمری کی وجہ سے پیچھے رہ جانے کے بعد مجھے خاصا مہنگا انتظام کرنا پڑا۔ یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین اساتذہ نے میرے گھر آ کر ماں کی زیرنگرانی بیٹیوں کو پڑھایا۔

میرے بھائی نے جس زمانے میں ایم بی بی ایس کیا' ان دنوں ڈاکٹری کی یہ ڈگری مال و دولت کے خزانے کا ''کھل جا سم سم'' تھی' کیونکہ پورے ملک میں (اور منٹگمری' حال ساہیوال میں تو اپنی آنکھوں دیکھا کہ) ایل ایس ایم ایف یعنی ڈپلومہ ہولڈر ڈاکٹروں کی کمائی بھی حساب کتاب میں نہ آتی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو سرکاری ملازمت کے اس بانڈ سے استثناء حاصل کیا جو ایم بی بی ایس کے ہر طالب علم سے حکومت اُن دنوں داخلے کے وقت ہی لے لیتی تھی اور جس سے گلوخلاصی پانے میں سی آئی ڈی کے وہ روزنامچے بھی یقیناً کام آئے ہوں گے جن میں گزشتہ تین برسوں میں ان کی اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی سے سرگرم وابستگی کا کچا چٹھا درج تھا' ایم بی بی ایس کا نتیجہ آتے ہی اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت

سے استعفا دینے کے ساتھ جماعت اسلامی کو درخواستِ رکنیت پیش کرنے کی کارروائی وہ غالباً ایک ہی دن میں مکمل کر بھی چکے تھے۔ سرکاری نوکری کی پابندی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ان کی اوّلین ترجیح لاہور میں قیام تھا تاکہ جماعت کے اکابرین بالخصوص مولانا مودودی مرحوم و مغفور اور مولانا اصلاحی سے قرب رہے' لیکن والد مرحوم کی علالت اور ان کی طرف سے منٹگمری میں قیام پر اصرار نے انہیں اس چھوٹے شہر کی طرف مراجعت پر مجبور کر دیا' تاہم یہ بھی کوئی گھاٹے کا سودا نہ تھا' کیونکہ وہاں اگر وہ جم کر پرائیویٹ پریکٹس کرتے تو ایک اچھے بھلے خوش حال شہر میں پہلے نہیں تو دوسرے ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوتے۔

انہوں نے منٹگمری پہنچتے ہی جماعت اسلامی کے شعبۂ خدمتِ خلق کے تحت چلنے والی ڈسپنسری میں بہت معمولی معاوضے پر صبح کے دو تین گھنٹے دینا طے کر لیا اور گھر میں شام کی پریکٹس کے لیے والدین کے سامنے شادی کی شرط داغ دی۔ ''خیراتی شفاخانے کی بات اور ہے لیکن یہاں مجھے شرفاء کی جن خواتین کے نخرے سہنے پڑیں گے' ان کا علاج کر کے میں اپنے آپ کو کسی آزمائش میں ڈالنا منظور نہیں کر سکتا'' ان کا اصرار تھا۔ چنانچہ دو تین ماہ کے اندر اندر ان کا گھر بسا دیا گیا۔ مقامی مدرسہ بنات الاسلام سے مڈل پاس اور دورۂ ترجمۂ قرآن سے فارغ ہماری بہن کی متوسط نوکری پیشہ گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک کلاس فیلو ان کی دلہن بنیں' حالانکہ ان دنوں نئے نئے ڈاکٹر' لیڈی ڈاکٹر کے رشتے سے کم کسی بات پر سوچنے کو آمادہ نہ ہوتے تھے۔ یہ شرط پوری ہو گئی تو بڑے اہتمام سے پرائیویٹ کلینک اور لیبارٹری کو آراستہ کیا گیا اور نئے نئے شوق میں وہ کچھ دنوں اس میں باقاعدگی سے بیٹھے بھی۔ مجھے خود ہی ڈسپنسر کی ابتدائی تربیت دی اور ساتھ لگا لیا۔ بہت جلد پریکٹس چل نکلی اور مشہور ہو گیا کہ نئے ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا ہے۔ ہُن برسنے لگا اور خود میرے ہاتھ میں بھی صفائی آنے لگی لیکن یہ بہار چند روزہ ثابت ہوئی' کیونکہ جماعت میں ان کی مصروفیت' قرآن مجید کے درس اور انفرادی ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہونے لگا اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تو مریضوں کو قسمت سے ہی دستیاب ہوتے' البتہ میری ڈاکٹری چل گئی۔

مجھے اُس وقت تو کوئی اندازہ نہ تھا' بعد میں معلوم ہوا کہ جماعت میں اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی تھی۔ ڈاکٹر بھائی نے منٹگمری آ کر رکنیت حاصل کرنے کے بعد اندر کا جو حال دیکھا' اس سے ان کی بے چینی روز بروز بڑھنے لگی اور پھر ایک طرف تو اصلاحِ احوال میں شب و روز ان کا شغف جماعت میں انہیں ترقی کے زینے کی طرف لے جا رہا تھا کہ وہ حلقہ کی شوریٰ کے

رکن منتخب ہوئے اور پھر مقامی جماعت کے امیر بنا دیئے گئے لیکن دوسری طرف ان کا عدم اطمینان تھا کہ پاؤں کا چکّر بن گیا۔ جماعت کے شفا خانے کی ملازمت بھی چھوڑ دی کہ اپنے ذاتی کلینک سے غیر حاضری تو گوارا تھی' شفا خانے کے معمولات کو وہ درہم برہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر اوکاڑہ' لاہور اور لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے وہ سفر شروع ہوئے جن کا نقطۂ عروج ماچھی گوٹھ کا اجتماع تھا اور یہ ساری کہانی خاصی معروف ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ اس فکر میں انہیں سب مصلحتیں بھول گئی تھیں۔ گھر والوں کی بھی سب امیدیں خاک میں مل گئیں کہ ان کی ڈاکٹری سے روٹی بھی بمشکل چلتی' جس ٹھاٹھ باٹھ کا انتظار تھا اس کا سایہ بھی گھر پر نہ پڑ سکا۔

جماعت اسلامی سے مستعفی ہونے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ٹِک کر بیٹھتے اور اپنی دنیا بنانے کی فکر کرتے' جیسے جماعت کو داغِ مفارقت دینے والے دوسرے لوگوں نے کیا۔ ان میں سے اکثر نے اقامتِ دین کا یہ بوجھ سر سے اتار کر سکھ کا سانس لیا تھا' گویا رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت' لیکن میرے بھائی پر اگلے کئی سال قیامت کے گزرے۔ انہیں کسی کل چین نہ آتا اور وہ ایک نئے سفر کے آغاز کا سامان بہم پہنچانے کے لیے راولپنڈی سے کراچی تک ہر اُس دروازے پر دستک دیتے پھرے جہاں سے انہیں ادائیگی فرض کے اپنے اس جنوں پر داد کی توقع تھی' لیکن کہیں سے حوصلہ افزا جواب نہ ملا تو آخر انہوں نے تن تنہا چل کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا اور آج ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ انہوں نے ایک چھوٹا سا قافلہ ترتیب دے لیا ہے لیکن اس حقیقت کا ادراک کم لوگوں کو ہوگا کہ اس کی اوٹ میں پچیس برسوں کی کیسی محنت شاقہ کا پہاڑ اوجھل ہے —— بالوں کو سفید کر دینے والی ذہنی مشقت' کمر توڑ دینے والی جسمانی سعی و جہد۔ اس کے دوران ان کا واحد سہارا قرآن مجید اور سیرتِ طیبہ سے والہانہ لگاؤ تھا جس نے انہیں گویا اپنا اسیر بنا لیا تھا' possess کر لیا تھا۔ میرے ڈاکٹر بھائی نے سکون دل کی خاطر سہارا ڈھونڈنے کے لیے روایتی بزرگوں کی خدمت میں بھی حاضری دی' تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی وقت گزارا لیکن نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی؟ اسی کتابِ ہدایت کے سائے تلے جس کی عظمت کا احساس تب تک نہیں ہوتا جب تک بقول اقبال ضمیر پر اس کا نزول نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ اچھی تحریر وہ ہوتی ہے جس کی اُٹھان زوردار ہو' درمیان میں بھی روانی برقرار رہے اور اختتام تک پہنچتے پہنچتے قاری محسوس کرنے لگے کہ پیغام اس نے وصول پا لیا ہے' لیکن میں دوہری مشکل سے دوچار ہوں۔ لکھنے کا قرینہ تو آتا ہی نہیں' موضوع بھی ایسا لے بیٹھا ہوں

جسے سمیٹنا بس میں نظر نہیں آتا۔ آپ کرم فرمائیں تو اسے ایک گھر والے کی گواہی سمجھ لیں جس میں زورِ کلام اور ربط باہم کو تلاش نہیں کیا جاتا' واقعات کی سچائی پر نظر رکھی جاتی ہے۔ ایک ایسی شخصیت پر لکھنا آسان تو نہیں جسے ایک دنیا جانتی پہچانتی ہو لیکن جسے ہر دیکھنے والے نے کسی خاص زاویے سے ہی دیکھا ہو۔ میں نے اسے اندر باہر ہر طرف سے دیکھا لیکن اپنے عجزِ بیان کا کیا کروں!۔ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔

میرے بھائی نے مواقع کی فراوانی کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گزاری۔ سربرآوردہ اور سکہ بند صحافی مجیب الرحمٰن شامی نے ''ندا'' میں میرے ایک ادارتی نوٹ پر بدک کر مؤدبانہ انداز میں ان کے لتے لیے' تاہم یہ لکھے بغیر نہ رہ سکے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کا رہن سہن سترہ گریڈ کے ایک سرکاری ملازم کے معیار سے بلند نہیں۔ وہ میرے بھائی کا یہ رہن سہن اور life style خود دیکھ چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد ایک ایسے سرکاری ملازم کا معیارِ زندگی تھا جو ''اوپر کی آمدنی'' سے بھی محروم ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے بھائی کا حال اس سے بھی پتلا رہا۔ میں نے کتنی ہی خواہش رکھی اور لاکھ کوشش کی کہ ان کے اور میرے معیارِ زندگی کا فرق کم سے کم رہ جائے۔ انہوں نے میرا تعاون قبول بھی کیا اور محض اس بنا پر کیا کہ اپنی بے پناہ عملی کوتاہیوں کے باوصف میں ان کے نظریات اور کام سے سو فی صد اتفاق رکھتا تھا لیکن یہ فرق دور نہیں کیا جا سکا' شاید یہ ممکن ہی نہیں۔ ان کی ترجیحات میں دُنیا کی آسائش کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے۔ ان کے گھر سے آج تک بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن کا گزر بھی نہیں ہوا۔ جن دنوں اس چھوٹی سکرین پر ''الہدیٰ'' کے وسیلے سے ان کا راج تھا' میں ان کے ''ڈیرے'' یعنی قرآن اکیڈمی کے باسیوں کو یہ پروگرام دکھانے کے لیے ہر ہفتے اپنا چھوٹا سیٹ کار میں رکھ کر لاتا رہا اور خواتین کے لیے یہ اہتمام کبھی ہو سکا' کبھی نہ ہوا۔

اکیڈمی کے جن کوارٹروں میں ان کی رہائش ہے' وہ منصوبہ بندی کا شاہکار ہیں۔ ان میں نہ گرمی کا آرام ہے نہ سردی کا۔ چھ کنال کے پلاٹ میں ایک پوری دنیا بسائی جائے تو نتیجہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔ کئی سال پہلے بلا کی گرمی اور شدید حبس میں انہوں نے باقاعدہ روزہ رکھنے کے ساتھ رمضان المبارک میں جو پوری رات قرآن مجید کے ساتھ بسر کرنے کا سلسلہ شروع کیا' جو بحمد اللہ رواں ماہِ مبارک میں بھی جاری ہے' تو دیکھنے والوں کے پسینے چھوٹنے لگے۔ ساتھیوں نے بھی اصرار کیا کہ اپنے لیے دن کے آرام کی غرض سے ایک کمرے میں اے

سی لگوا لیجئے' میں بہت پہلے سے یہ درخواست کرتا آ رہا تھا لیکن دو سال انہوں نے پس و پیش میں گزار دیئے اور صحت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بالآخر ہتھیار ڈالے تو اس شرط پر کہ یہ اضافی بوجھ انجمن خدام القرآن پر نہ ہوگا۔ چنانچہ ان کے گھر کا واحد ایئر کنڈیشنر میری ملکیت ہے اور اس کے لیے بجلی کا سب میٹر الگ سے لگایا گیا ہے تاکہ بل بھی مجھ سے ہی وصول کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ میرے بھائی کی یہ سب محنت' یہ سارا ایثار اپنے دین کے لیے قبول فرمائے۔ انہوں نے اقامت دین کے لیے وہ مشکل لیکن مسنون و ماثور راستہ اختیار کیا ہے جو جاتا تو سیدھا منزل کی طرف ہے لیکن خارزار بھی ہے اور اس کے ذریعے منزل کو پا لینے کی امید دیوانے کے خواب سے بڑھ کر نہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ نشاناتِ راہ کو متعین کر جائیں تاکہ پیچھے آنے والے سفر جاری رکھیں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا سچا وعدہ پورا ہو جائے گا۔ اور یہ کام وہ بحمد اللہ پوری استقامت سے کر رہے ہیں' دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ۔ ان کے بائیں ہاتھ پر دل و دماغ کی لکیر مشترک ہے' قلب و ذہن میں کوئی کشمکش نہیں پائی جاتی۔ دل کا فیصلہ دماغ قبول کر لیتا ہے اور دماغ کی بات کبھی دل نے رد نہیں کی اور نورٌ علیٰ نور یہ کہ دل و دماغ دونوں آسمانی ہدایت سے فیض یافتہ ہیں۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست' تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

میرے ماں جائے' میرے امیر محترم کی زندگی کا مقصد دین کی سرفرازی ہے' لیکن دین تو اللہ کا ہے اور وہی وقت آنے پر اس کے غلبہ کا انتظام بھی کرے گا' ہاں میرے بھائی کو اس مزدوری کی اجرت میں اپنے رب کی خوشنودی اور نجاتِ اُخروی مل جائے تو فبہا المراد۔ بونس میں اللہ تعالیٰ والد مرحوم سے بھی راضی ہو جائیں تو یہ توقع حضور ﷺ کے اس فرمان کی بنیاد پر ہے کہ صدقہ جاریہ کی اعلیٰ ترین شکل کسی مسلمان کے بیٹے کا قرآن کو سمجھنے اور اس کے پیغام کو عام کرنے میں زندگی کھپا دینا ہے۔ ہمارے شفیق والد زندگی بھر اپنے بچوں کے لیے محنت مشقت کرتے اور آخری عمر میں ذہنی و جسمانی عوارض کا عذاب سہتے دنیا سے گئے ہیں۔ انہوں نے اولاد کا سکھ پایا نہ اپنے کنبے کو پھلتے پھولتے دیکھا' حالانکہ چند برس اور جیتے تو دنیا کی کس نعمت سے اور کیوں محروم رہتے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے آرام کی اس محرومی کو آخرت کی آسائش سے بدلنے پر قادر ہے' وہ یہ کرم ضرور فرمائے گا۔ یوں ڈاکٹر اسرار احمد ہم سب بھائی بہنوں کے ان معنوں میں بھی محسن ہیں کہ والدین پر ہم سب کا قرض اُتار دیں گے' ان شاء اللہ۔ اور کیا باری تعالیٰ میرے اور میرے بچوں کے حق میں بھی ان کی سفارش قبول نہ فرمائے گا؟ ooo

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کا تاریخ میں مقام و مرتبہ

محمد نذیر یٰسین

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دینی و ملی خدمات کا اگرچہ وسیع پیمانہ پر اعتراف کیا جا رہا ہے، تاہم تاریخ میں اُن کے اصل مقام و مرتبہ کے تعین کے لیے برعظیم پاک و ہند میں تجدید و احیائے دین کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس خطہ میں اولین قابل ذکر دینی تحریک جس نے تاریخ کے صفحات پر گہرے نقوش مرتب کیے، حضرت شیخ احمد سرہندی المعروف مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی مغل شہنشاہ اکبر کے ایجاد کردہ نام نہاد دین الٰہی کے خلاف منظم جدّوجُہد تھی۔ اس جدّوجُہد کے دوران آپؒ کو قید و بند سمیت بہت سی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، تاہم آپؒ، آپ کے بیٹوں اور خلفاء کی مساعی بالآخر رنگ لائی۔ نہ صرف دین الٰہی ناکام و نامراد ہوا بلکہ مغل بادشاہوں کے طرز فکر و عمل میں قدرے بہتری بھی پیدا ہوئی، یہاں تک کہ اہل ہند کو اورنگ زیب عالمگیر ایسے عادل شخص کی حکمرانی بھی میسّر آئی۔ مزید برآں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے اندر در آنے والے غیر اسلامی تصورات و رسومات کے خلاف بھی مؤثر خدمات سرانجام دیں۔

پاک و ہند کے خطہ میں تجدید و احیائے دین کی ایک اور اہم کڑی امام الہند، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا جاتا ہے جن کی خدمات کا دائرہ بھی دینی و سیاسی دونوں سطحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ آپؒ نے پہلی بار فارسی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ ترویج و اشاعتِ حدیث کے لیے بہت مفید کام کیا۔ آپؒ کی سیاسی خدمات میں سے اہم ترین، والیٔ افغانستان احمد شاہ ابدالی کو بلا کر مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کمزور کرنا قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم آپؒ کا اصل کارنامہ ''فَكٌّ كُلَّ نِظام'' کا فلسفہ پیش کرتے

ہوئے شکستہ حال مروّجہ نظامِ اسلامی کی عمارت مسمار کر کے اسلام کے خالص اصولوں کے مطابق نظامِ اسلامی کی ایک نئی عمارت کی تعمیر کا پیغام دیتا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اسی فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے آپ کے پوتے حضرت اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید رحمہما اللہ نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ اس تحریک میں ان دونوں حضراتؒ نے جامِ شہادت نوش کیا تھا' اس لیے اسے تحریک شہیدینؒ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ حضرات شہیدینؒ کی یہ حکمتِ عملی بلاشبہ سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق تھی کہ پہلے ریاستِ مدینہ کی طرز پر ایک اسلامی مرکز کا قیام عمل میں لایا جائے اور بعد ازاں اس کا دائرہ پورے ہندوستان تک پھیلا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے شمال مغربی سرحدی علاقہ ہی موزوں ترین تھا کہ اُس وقت پنجاب سکھوں کے قبضہ میں تھا' جبکہ باقی ماندہ ہندوستان پر انگریز چھائے ہوئے تھے۔ اُنہیں افغانستان سے خاطر خواہ امداد کی توقع بھی تھی' تاہم خالص اسلامی اصولوں پر ایک ریاست کا قیام نہ تو افغانیوں کو گوارا ہو سکا اور نہ ہی مقامی پختون آبادی کو' لہٰذا غیروں (سکھوں و انگریزوں) کی سازشوں اور اپنوں کی بے وفائی نے اس اسلامی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے دیا۔ ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے ساتھ بالاکوٹ کے فیصلہ کن معرکہ میں یہ تحریک بالآخر ناکامی سے دوچار ہوگئی' تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے کچھ باقیات الصالحات نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کے خاتمے تک اپنی جدّوجُہد جاری وساری رکھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دنوں میں تحریک شہیدین ہی کے کچھ متعلقین ومتاثرین میں ایک نیا جوش وولولہ پیدا ہوا۔ شاملی وتھانہ بھون کے علاقوں میں حضرت امام ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ایک اور اسلامی تحریک برپا ہوئی اور ان علاقوں میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست بھی قائم کر لی گئی' تاہم انگریز کے مقابلہ میں یہ ریاست بھی اپنا وجود برقرار رکھنے میں ناکام رہی۔ اس تحریک میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی' حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم ایسی عظیم شخصیات شامل تھیں۔

ان مسلسل ناکامیوں کے بعد حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہم نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی لاتے ہوئے ۱۸۶۶ء میں مدرسہ دیوبند کی صورت میں دینی تعلیم کی ایک عظیم الشان تحریک کا آغاز کیا۔ اب کی بار انہوں نے مسلمانانِ ہند

کی اخلاقی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا تھا تاکہ ان کی تعلیم وتربیت کے ذریعے کامیاب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مطلوبہ سازگار فضا پیدا کی جاسکے۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے اپنے لیے کم از کم پچاس برس کا ہدف بھی مقرر کرلیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے اللہ تعالیٰ کے حضور کم از کم پچاس برس تک دارالعلوم دیوبند کے قائم رہنے کی دعا بھی کی تھی۔ (بحوالہ نقش حیات' از مولانا حسین احمد مدنیؒ' جلد دوم' صفحہ ۲۰۹)

اُن کی اس بے لوث تحریک کے بطن سے بہت سی مزید تحاریک نے جنم لیا' جن میں سے اہم ترین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ' صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کی تحریک ریشمی رومال تھی' جو پہلی جنگ عظیم کے دوران شروع ہوئی تھی۔ چونکہ اُس وقت دارالعلوم دیوبند کو قائم ہوئے بھی پچاس برس بیت چکے تھے لہٰذا جنگ عظیم کے آغاز کو آپؒ نے یقیناً اپنے لیے نصرتِ غیبی ہی خیال کیا ہوگا۔ اُن کی اس تحریک کا مقصد ہندوستان کو آزادی دلا کر اسے دوبارہ ایک اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا اور اس طرح اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ سرانجام دینا تھا' جیسا کہ حالتِ نزع کے وقت آپؒ کا یہ واقعہ ثابت کرتا ہے:

مولانا شبیر احمد مرحوم کا بیان ہے (جس کو مولانا محمد جلیل صاحب نے نقل فرمایا) کہ حضرت نے تھوڑی دیر آنکھیں کھول کر چھت کی طرف دیکھا' پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے۔ اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی''۔

(نقش حیات' جلد دوم' صفحہ ۲۶۹)

یہ ایک قابل افسوس حقیقت ہے کہ شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد اُن کے اس مشن کو صرف آزادیٔ ہند تک ہی محدود کر دیا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ آزادی کے لیے جو راستہ منتخب کیا گیا' وہ بھی شیخ الہند کے افکار سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ آپؒ کی تحریک بنیادی طور پر تو جہاد بالسیف کے اصول پر مبنی تھی' تاہم جدید طرز پر چلائی جانے والی تحریکِ خلافت کے ثمرات کی روشنی میں آپؒ نے اسارتِ مالٹا سے رہائی پر حصولِ آزادی کے اس نئے پُرامن طریقۂ کار (ایجی ٹیشن کی سیاست) پر صاد کر دیا تھا۔ لیکن انگریزی حکومت نے کمال عیاری سے کام لیتے ہوئے اس تحریک کو جمہوری سیاست کی طرف موڑ دیا اور سادہ لوح مسلمان رہنما انگریز کے پھیلائے

ہوئے اس جال میں پھنس کر ہمیشہ کے لیے انتخابی سیاست کے اسیر ہو گئے۔ انگریز کا ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کا فارمولہ تیر بہ ہدف نسخہ ثابت ہوا جس کا نتیجہ مسلمانانِ ہند بالخصوص یہاں کی دینی قوتوں کے تقسیم در تقسیم ہونے کی صورت میں برآمد ہوا۔

جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، خاکسار، احرار اور خدائی خدمت گار وغیرہ جماعتوں کا منظرِ عام پر آنا اور خود جمعیت علمائے ہند کا تقسیم ہو جانا اسی انتخابی سیاست کا شاخسانہ تھا۔ آپؒ نے انتخابی سیاست پر ہرگز صاد نہیں کیا تھا بلکہ اس کی مخالفت کی تھی، جیسا کہ آپؒ کے ترکِ موالات کے مشہورِ عام فتویٰ کے درج ذیل جزو سے اس حقیقت کا بخوبی پتہ چلتا ہے:

> ''اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہ ہی اقتضا ہونا چاہیے کہ وہ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے''۔ (نقش حیات، جلد دوم، صفحہ ۲۵۷، شق ۲)

درحقیقت وطن واپسی پر شیخ الہند نے جو لائحہ عمل علمائے ہند کے سامنے رکھا تھا، وہی ہے جس کا اعتراف نامور دیوبندی عالم دین مولانا زاہد الرشدی نے ندائے خلافت کی خصوصی اشاعت (شمارہ ۱۷) میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں کیا ہے، یعنی: (۱) مسلمان باہمی اختلافات سے گریز کرتے ہوئے متحدہ کردار ادا کریں (۲) قرآن کریم کی تعلیمات کے فروغ اور عام مسلمان کو قرآن کریم سے شعوری طور پر وابستہ کرنے کے لیے ہر سطح پر دروسِ قرآن کا اہتمام کیا جائے (۳) مسلمان اپنے شرعی معاملات طے کرنے کے لیے امارتِ شرعیہ کا قیام عمل میں لائیں اور ایک باقاعدہ امیر منتخب کر کے اس کی اطاعت میں کام کریں۔

راشدی صاحب انصاف کے ساتھ بتائیں کہ انتخابی سیاست میں حصہ لے کر اور تقلید جامد پر پورا زور صرف کرنے کے نتیجہ میں مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوتا ہے یا پھر انتشار اور تقسیم در تقسیم کی راہیں ہموار ہوتی ہیں؟ پھر کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ اہل دیوبند میں سے کچھ لوگ آج بھی عوامی دروسِ قرآنی (جن میں اختلافی باتیں کم ہی بیان ہوتی ہیں اور زیادہ زور عقائد و اعمال کی اصلاح پر دیا جاتا ہے) کی مخالفت کو اپنا مستقل وطیرہ بنائے ہوئے ہیں؟ باقی جہاں تک امارتِ شرعیہ کا تعلق ہے تو اس کا قیام بھی بین المسالک ہم آہنگی کو فروغ دے کر، فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر اور انتخابی سیاست کو خیر باد کہہ کر ہی ممکن ہے۔ امارتِ شرعیہ کے قیام کے بعد تو انتخابی سیاست کی گنجائش ہو سکتی ہے، تاہم امارتِ شرعیہ کے قیام کے

لیے انتخابی سیاست کارگر و مفید ثابت ہونے کی بجائے الٹا مضر ثابت ہو رہی ہے۔

شیخ الہندؒ کے لائحہ عمل کے متعلق ایک اور حقیقت جناب راشدی صاحب بیان کرنا شاید بھول گئے ہیں، یعنی: آپؒ کا جدید تعلیم کی ضرورت و افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے جامعہ ملیہ کے قیام کی طرف قدم بڑھانا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل دیوبند نے ایک طویل عرصہ تک جدید تعلیم کی اہمیت کو نظر انداز کیے رکھا' حالانکہ جدید عصری تعلیم کے بغیر دنیا میں کامیابی تو درکنار' اپنی بقا کو قائم رکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ سرسید احمد خان نے اسی حقیقت کا احساس کرتے ہوئے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ سے جدید تعلیم کے حصول کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس جدید تعلیم کے نتیجہ میں پھیلنے والی روشن خیالی اور مذہب بیزاری کے رجحان نے جدید و قدیم تعلیم کے امتزاج کی ضرورت کا احساس پیدا کیا' جس کا نتیجہ ندوۃ العلماء کے قیام کی صورت میں نکلا۔ اہل دیوبند اور علی گڑھ کے اشتراک سے جامعہ ملیہ کا قیام اسی مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا تھا جیسا کہ آپؒ کے درج ذیل الفاظ اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں:

> ''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اُس درد (کہ جس میں میری ہڈیاں گھلی جا رہی ہیں) کے غم خوار مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں و کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقامات' دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا''۔
>
> (نقشِ حیات' جلد دوم' صفحہ ۲۵۹)

جدید تعلیم کی اہمیت کا شدت کے ساتھ احساس آپؒ کو تحریک خلافت کی وجہ سے بھی ہوا تھا جس میں قائدانہ کردار ادا کرنے والے اکثر حضرات یعنی مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہم نے جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر اُن جدید عصری تقاضوں کے مطابق احتجاجی تحریک چلائی تھی جن سے اہل ہند قبل ازیں نابلد تھے۔

شیخ الہندؒ کے غلبۂ دین کے درد کا زیادہ احساس بھی جدید تعلیم یافتہ لوگوں ہی میں پایا جاتا تھا جن میں سرِفہرست مولانا ابوالکلام آزاد تھے' جن کے متعلق آپؒ کا یہ فرمان بہت مقبول ہوا کہ اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی قائدانہ صلاحیتوں اور دینی رجحان کی بنا پر آپؒ نے علمائے ہند کو مولانا آزاد کی بیعت کر لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس مشورہ کو قبول نہ کرنے کی کئی توجیہات ہو سکتی ہیں' تاہم ایک بڑی وجہ جدید و قدیم تعلیم سے فارغ التحصیل لوگوں کے مابین حصولِ قیادت کی کشمکش تھی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء کو

قیادت کے لیے موزوں نہیں سمجھتا تھا جبکہ علماء کرام جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قیادت کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حصول قیادت کی یہ رسہ کشی آج بھی جاری ہے' تاہم علمائے کرام کی خدمت میں بصد احترام عرض ہے کہ قیادت وحکمرانی کے لیے عصری علوم اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا شرطِ اوّلین ہے جو اُن کے ہاں مفقود نہیں تو شاذ ضرور ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت طالوت اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم عصری علوم اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر ہی قیادت کے حقدار قرار پائے تھے۔

المختصر شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد ہندوستان کی دینی قوتیں تقسیم در تقسیم کے المیہ سے دوچار ہوگئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو علماء کے رویّے سے دل برداشتہ ہوکر ہمیشہ کے لیے کانگرس کے ہوکر رہ گئے حتیٰ کہ غلبۂ دین کا مشن بھی فراموش کر بیٹھے' مگر اُن کے اس مشن کو جمعیت علمائے ہند ترجمان ''الجمعیۃ'' کی ادارت سے وابستہ نوجوان مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھالیا۔ مولانا مودودیؒ نے نہ صرف یہ کہ غلبۂ دین حق کے لیے جماعت اسلامی قائم کی بلکہ انگریزی دستور کے تحت انتخابی سیاست میں حصہ لینے کی پورے شدو مد کے ساتھ مخالفت بھی کی۔ اگرچہ شیخ الہندؒ کے اپنے مکتبۂ فکر سے بھی کئی جماعتوں وتحاریک (تبلیغی جماعت اور احرار وغیرہ) نے جنم لیا' تاہم یہ سب اپنے مقاصد کے حوالے سے غیر واضح تھیں' اور یہی انگریز دور میں اُبھرنے والی اکثر تحاریک کا المیہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد وعزائم کا برسرِ عام اعلان و پرچار نہ کرسکی تھیں' جس کے نتیجہ میں بعد میں آنے والے لوگ ان تحاریک کے بانیان کے حقیقی عزائم ولائحۂ عمل کو جاننے سے محروم رہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال تبلیغی جماعت ہے جس کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے شاید سان وگمان میں بھی نہ ہو کہ اُن کی شروع کردہ تحریک بالآخر تبلیغ برائے تبلیغ تک محدود ہوکر رہ جائے گی اور غلبہ واقامتِ دین کا وہ مشن جو شیخ الہندؒ کی ہڈیوں کو گھلائے جارہا تھا' کو بالکل فراموش کر بیٹھے گی۔

مولانا مودودیؒ نے اپنے مقاصد وعزائم کو تو بالکل واضح کردیا تھا تاہم اُنہیں ان مقاصد کے حصول کے لیے واضح لائحۂ عمل مرتب کرنے کا موقع نہ ملا' یہاں تک کہ تقسیم ہند کا وقت آن پہنچا۔ انتخابی عمل کے نتیجہ میں قیام پاکستان کے واقعہ نے اُن کی سوچ میں بھی تبدیلی پیدا کردی۔ اُنہوں نے خیال کیا کہ جس طرح عوام نے مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی پذیرائی کی تھی' اُسی طرح جماعت اسلامی بھی نفاذِ اسلام کے نام پر بھرپور عوامی حمایت حاصل کرسکتی ہے۔ جماعت اسلامی سمیت مذہبی حلقوں کے مطالبہ پر قرارداد مقاصد کی منظوری نے نہ صرف

اُنہیں حد سے زیادہ پُراعتماد بنا دیا بلکہ اُن کے اِس اعتراض کو بھی رفع کر دیا کہ غیر اسلامی دستور کے تحت انتخابات میں حصہ لینا درست نہیں' لہٰذا وہ انتخابی سیاست میں کود پڑے۔ اقتدار کی اس کشمکش میں پڑ کر وہ داعی الی اللہ کی بجائے محض ایک سیاستدان بن کر رہ گئے۔ مذہبی حوالے سے اُن کی شخصیت پہلے ہی متنازعہ بنا دی گئی تھی' میدانِ سیاست میں داخل ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو مزید متنازعہ اور دوسروں کا حریف بنا لیا' حالانکہ داعی کی حیثیت ہمیشہ ناصح و ہمدرد کی سی ہوتی ہے نہ کہ مقابل و حریف کی سی۔

جماعت اسلامی نے الیکشن کی سیاست میں حصہ لینے کی جس پالیسی کو اختیار کیا تھا' اُس سے اختلاف کرتے ہوئے ۱۹۵۷ء میں کئی نامور لوگ جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے جن میں اُس وقت کے نوجوان مگر آج مسلم اُمہ کے ممتاز ترین اسکالرز میں شمار کیے جانے والے ڈاکٹر اسرار احمد بھی شامل تھے۔ صرف اور صرف اقامت و غلبۂ دین کے لیے قائم کی جانے والی جماعت اسلامی کا انتخابی سیاست میں شریک ہو جانا اپنی جگہ یقیناً ایک عظیم المیہ تھا' لیکن اس سے بھی بڑا المیہ یہ تھا کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو جانے والے حضرات اپنی کوئی علیحدہ جماعت بنانے میں ناکام رہے' حالانکہ اُن میں مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن ایسے جیّد و نامور علماء بھی شامل تھے۔ اس سلسلہ میں کی جانے والی کوششیں بھی بارآور نہ ہو سکیں' جس کی وجہ سے دین کا حقیقی درد رکھنے والے ڈاکٹر اسرار احمد کے کرب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسی دور میں اُمت مسلمہ پر بیتنے والے دو المناک سانحات نے اُن کی بے چینی میں مزید اضافہ کیا۔ ان میں سے پہلا واقعہ ۱۹۶۷ء میں قبلۂ اوّل یعنی بیت المقدس پر اسرائیلی قبضہ تھا' جبکہ دوسرا واقعہ ۱۹۷۱ء میں سب سے بڑی اسلامی ریاست یعنی پاکستان کا دولخت ہونا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد و اقوام پر نازل ہونے والے مصائب' آلام اور سانحات کسی نہ کسی ردِعمل کا اظہار ضرور کرتے ہیں خواہ یہ ردِعمل ہوش کی صورت میں ہو' جوش کی صورت میں ہو' مایوسی کی صورت میں ہو' پست ہمتی کی صورت میں ہو اور یا پھر بے حسی کی صورت میں ہو۔ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۱ء کے واقعات کے نتیجہ میں جوش' مایوسی' پست ہمتی اور بے حسی کے مناظر تو دیکھنے کو بہت ملے مگر ہوشمندی کا مظاہرہ کرنے والے حضرات بہت ہی کم ہوں گے۔ ان ہوشمند حضرات میں سے اہم ترین میرے نزدیک ڈاکٹر اسرار احمد ہیں جنہوں نے ۱۹۷۲ء میں زوالِ اُمت کے حقیقی سبب یعنی ''قرآن حکیم سے دُوری کے مرض'' کی تشخیص کرتے ہوئے فہمِ قرآن کو عام کرنے کے لیے نہ صرف ''انجمن خدام القرآن'' قائم کی بلکہ اپنے پروفیشن کو بھی خیرباد

کہہ دیا۔ اُن کی رجوع الی القرآن کی اس تحریک نے ردِعمل میں فہم قرآن کی دیگر بہت سی تحاریک کو بھی جنم دیا' اور آج قرآن کا فہم اور پیغام ایک بہت بڑے طبقہ کو پہنچ چکا ہے تو یقیناً اسے بالواسطہ طور پر ڈاکٹر اسرار احمد کا فیض ہی کہا جا سکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مکی دَور میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا جو کام سرانجام دیا تھا' اسے قرآنی اصطلاح میں جہاد بالقرآن کا نام دیا جا سکتا ہے اور ہم جانتے ہی ہیں کہ اس جہاد بالقرآن نے ہی جہاد بالسیف کے لیے بنیاد فراہم کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سنت نبوی ﷺ کی پیروی میں ہی قرآن کی اشاعت و تبلیغ کے مشن کا آغاز کیا تھا۔ اُن کی اس جدّوجُہد کو تاریخ میں ان شاء اللہ وہی مقام عطا ہوگا جو حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مولانا قاسم نانوتویؒ کی جاری کردہ اصلاحی تحاریک کو حاصل ہوا تھا کہ اُن کی مخلصانہ و بے لوث دینی تحاریک نے مستقبل میں مزید دینی و ملی تحاریک کو جنم دیا تھا۔

پاکستان کی دینی قوتوں کی طرف سے ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی مصلحت و عافیت پسندانہ پالیسی کے تحت ۱۹۷۳ء کے آئین کی منظوری نے ڈاکٹر صاحبؒ پر ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کی اہمیت کو دوچند کر دیا تو انہوں نے ۱۹۷۵ء میں اقامت و غلبۂ دین کے لیے تنظیم اسلامی کے نام سے ایک نئی جماعت کے قیام کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ۱۹۷۷ء کی اینٹی بھٹو تحریک کو جب نظامِ مصطفیٰ ﷺ تحریک کا نام دیا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی مخالفت کی اور قرار دیا کہ ایسی تحریک جس کی باگ ڈور سیکولر لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور جس کے پاس کوئی واضح لائحہ عمل بھی موجود نہ ہو' اُس سے اسلامی نظام کے نفاذ کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اُن کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا جب اس تحریک کے نتیجہ میں اسلام کی بجائے ضیاء الحق کی آمریت نے جنم لیا۔ بعد ازاں ۱۹۷۹ء کے انقلابِ ایران نے اُن کے اس موقف کی تصدیق بھی کر دی کہ اسلامی نظام کا نفاذ انتخابی عمل کے ذریعے نہیں بلکہ عوامی انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے نفاذِ اسلام کے کچھ نمائشی اقدامات کیے' تاہم روسی افواج کے افغانستان میں داخلہ کی بنا پر دینی جماعتوں کی زیادہ تر توجہ جہادِ افغانستان کی طرف پھیر دی گئی۔ جنرل ضیاء کے ہاتھوں نفاذِ اسلام کی اُمید پر ڈاکٹر صاحبؒ نے بھی اُن کی مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول کر لی تھی' مگر جلد ہی نا اُمید ہو کر اس سے مستعفی ہو گئے۔ مزید برآں انہوں نے دیگر دینی جماعتوں کی طرح جہاد افغانستان کے لیے اپنا عسکری ونگ قائم کرنے کی بجائے اپنی توجہ جہاد بالقرآن کی طرف مبذول رکھی۔ اس اثناء میں انہوں نے سیرت کے عمیق مطالعہ کے نتیجہ میں موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کے طریقۂ کار (منہج انقلابِ نبوی ﷺ) کو بھی اپنی تقاریر اور تحریروں

میں بیان کیا۔

روسی افواج کی واپسی کے بعد جب ۱۹۹۰ء میں ایک سازش کے تحت عراق کا کویت پر قبضہ کروایا گیا اور صلیبی افواج جزیرۃ العرب کی مقدس سرزمین پر اُتریں تو یہ اُمت مسلمہ کے لیے کٹھن آزمائش کا وقت تھا۔ آزمائش کی اس گھڑی میں اُمت کا درد رکھنے والے مختلف حضرات نے اپنے اپنے انداز میں ردِّعمل کا اظہار کیا' جبکہ ڈاکٹر صاحبؒ کا ردِّعمل سب سے زیادہ ہوش مندانہ تھا۔ انہوں نے جذباتی نعروں اور پُرتشدد ردِّعمل کی بجائے اُمت کے جملہ مسائل کے حل کی شاہ کلید یعنی ادارۂ خلافت کے قیام کی ضرورت واہمیت اُجاگر کرنے کے لیے ۱۹۹۱ء میں تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ قیامِ خلافت کے لیے اُن کی یہ پکار بظاہر نقارخانے میں طوطی کی صدا ثابت ہوئی کہ اس خطہ کی دینی سیاسی جماعتیں تو نام نہاد مغربی جمہوریت کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھیں' جبکہ جہاد فی سبیل اللہ کی مدعی جہادی تنظیمیں اس خام خیالی میں مبتلا ہو چکی تھی کہ محض عسکری جدوجہد کے ذریعے باطل قوتوں کو سرنگوں کیا جا سکتا ہے۔ عسکری جدوجہد کے ذریعے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کے قیام نے جہادی گروہوں کو تقویت عطا کی تو انہوں نے اہل کفر کے خلاف مسلح جہاد کی پلاننگ شروع کر دی۔ اسامہ بن لادن اور اُن کے رفقاء کے ان جہادی عزائم کو بھانپتے ہوئے اہل کفر نے سازشوں کے جال پھیلانے شروع کر دیے اور اس مقدس جہادی جذبے کو پُرتشدد کارروائیوں کی طرف موڑ دیا' جس کے نتیجہ میں جہاد ایسے مقدس فریضے کو فساد اور دہشت گردی کے القابات سے نواز دیا گیا۔ بلاشبہ طالبان و القاعدہ مجاہدین کی لازوال قربانیاں قابل رشک ہیں' مگر سوال یہ ہے کہ آیا ان قربانیوں کے نتیجہ میں خلافتِ اسلامی کا احیاء ہو سکے گا؟ کیا امریکا کی افغانستان میں شکست کے بعد اسلام ریاستی سطح پر ایک عالمی قوت کے طور پر اُبھر سکے گا یا پھر امریکا کی ممکنہ شکست کے ثمرات ایک بار پھر کسی اور باطل قوت (ممکنہ طور پر روس' چین یا یورپی یونین) کی جھولی میں جا گریں گے؟ اس ممکنہ خدشے کا تدارک کسی مضبوط اسلامی ملک میں خلافت کے احیاء کی صورت میں ہی ممکن ہے اور اس مقصد کے لیے پاکستان سے زیادہ موزوں ملک شاید ہی دنیا میں کہیں موجود ہو۔

یہاں پھر یہ بنیادی سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب اگرچہ انقلابِ ایران پر غور کرنے سے ہی مل جاتا ہے تاہم حالیہ کچھ واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ پاکستان میں وکلاء تحریک کی کامیابی اور ازبکستان کا حالیہ انقلاب اس حقیقت کی مکمل توثیق کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کا موزوں ترین و مؤثر ترین طریقہ

کار یہی ہے اور محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسی انقلابی فکر کے حامی و داعی تھے۔ بلاشبہ یہ واقعات عسکری جدّوجہد پر یقین رکھنے والے مجاہدین اسلام کے لیے ''رہنمائی'' کی حیثیت رکھتے ہیں تو اُن دینی جماعتوں کے لیے ''حجّت'' کی' جو انتخابی سیاست کے ذریعے نفاذ اسلام کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں اور صرف اسی طریقہ کو ممکن العمل سمجھتی ہیں۔ جلد یا بدیر ان دو متضاد نقطہ ہائے نظر کی حامل دینی قوتوں کو اُسی طریقۂ کار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کا پرچار ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی دینی خدمات کا تو بفضلہٖ تعالیٰ وسیع پیمانہ پر اعتراف کر لیا گیا ہے تاہم اُمید واثق ہے کہ اُن کے فلسفۂ انقلاب کو بھی ان شاء اللہ جلد ہی قبولِ عام حاصل ہو جائے گا۔ مستقبل میں جب بھی اس خطے میں اسلامی انقلاب برپا ہوگا تو داعیٔ انقلاب و داعیٔ خلافت کا مقام بلاشبہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو ہی ملے گا' جیسا کہ قیامِ پاکستان کے بعد علامہ اقبال کو مفکّر و مصوّرِ پاکستان تسلیم کیا گیا تھا۔

❁❁❁

بقیہ: خادمِ قرآن: کچھ یادیں' کچھ باتیں

((اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا)) (صحیح الجامع للشیخ ألبانی: ۱۸۷٤)

''بے شک اللہ تعالیٰ اِس اُمت میں ہر صدی کے آخر میں ایک ایسے شخص کو مبعوث فرمائیں گے جو اُمّت کے لیے دین کی تجدید کرے گا۔''

بلاشبہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ قرآن کریم کی طرف رجوع کی تحریک کے اعتبار سے اس صدی کے مجدّد تھے۔ اکثر دوست احباب یہ سوال کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد آپ کے کیا احساسات ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ جس دن سے ڈاکٹر صاحب کی وفات ہوئی تو یہ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں رہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہیں کہیں' آس پاس' آگے پیچھے اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے ہوں گے یا درس دے رہے ہوں گے۔ جب بھی ان کا تصور ذہن میں آتا ہے تو زبان پر بے ساختہ ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ'' جاری ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک داعی یا مبلغ کی کمائی اور صدقۂ جاریہ ہے جو اس کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں اس کی وفات کے بعد اس کے لیے جاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان کاوشوں کو اپنی جناب میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ آمین! ❁❁

ظروف و احوال

وفات محترم بانیٔ تنظیم رحمۃ اللہ علیہ

پرنٹ میڈیا کے آئینہ میں

بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر مختلف اخبارات نے جو سرخیاں ۱۵ اپریل ۲۰۱۰ء کی اشاعت میں لگائیں اُن کا ایک جائزہ پیش خدمت ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ محترم بانیٔ تنظیم کا انتقال ۱۳ اور ۱۴ اپریل کی درمیانی شب تقریباً اڑھائی بجے ہوا۔ اس وقت تک اکثر اخبارات چھپ چکے ہوتے ہیں اس لیے ۱۴ اپریل کی اشاعت میں اس خبر کا تذکرہ موجود نہیں' البتہ ۱۵ اپریل کو تمام اخبارات کے صفحۂ اوّل پر ذیلی سرخی کے طور پر یہ خبر موجود تھی۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے سرخی اس طرح جمائی: ''ممتاز عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد انتقال کر گئے' نماز جنازہ میں ہزاروں افراد کی شرکت''۔ یہی سرخی مختلف اسالیب میں روزنامہ ایکسپریس' روزنامہ جنگ' روزنامہ پاکستان' روزنامہ خبریں' روزنامہ دی نیوز' روزنامہ ڈان' روزنامہ بزنس ریکارڈر' روزنامہ آج کل' روزنامہ جسارت' روزنامہ امت' بی بی سی اردو' روزنامہ امن' روزنامہ کائنات' روزنامہ محشر کراچی' روزنامہ عوام کراچی' روزنامہ مقدمہ کراچی' روزنامہ ریاست کراچی' روزنامہ انصاف ٹائمز کراچی' روزنامہ دیانت' روزنامہ شرافت کراچی' روزنامہ آزاد ریاست' روزنامہ پرچم کراچی' روزنامہ آفتاب' روزنامہ وکٹوریہ پلس کراچی' روزنامہ جانباز' روزنامہ ٹیلی گراف کراچی میں شائع ہوئی۔ ان اخبارات میں سے اکثر نے محترم بانیٔ تنظیم کا فوٹو اور نماز جنازہ کی تصاویر بھی آویزاں کیں۔

اس موقع پر مرکزی شعبہ نشر و اشاعت کی جانب سے ایک پریس ریلیز جاری کیا گیا تھا اور اکثر اخبارات نے اُس کے مندرجات کو خبر کے طور پر شائع کیا۔ مرکز تنظیم اسلامی سے جاری ہونے والے پریس ریلیز کی عبارت یہ تھی:

> ''لاہور (پ ر) بانیٔ تنظیم اسلامی و صدر انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمد گزشتہ رات حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔ ان کی نماز جنازہ آج شام ۵ بجے سینٹرل پارک ماڈل ٹاؤن لاہور میں ادا کی جائے گی۔

ڈاکٹر اسرار احمد ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع حصار (ہریانہ' بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اپنے ضلع حصار میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن (MSF) کے فعال کارکن اور جنرل سیکرٹری رہے۔ اسی حیثیت سے قائداعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران ہی علامہ اقبال کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے ذہنی وقلبی رشتہ استوار ہوا اور احیائے اسلام کے لیے عملی جدوجہد کی امنگ سینے میں پرورش پائی۔ قیام پاکستان کے موقع پر براستہ سلیمانکی قافلے کے ساتھ بیس دن پیدل سفر کر کے پاکستان آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی' کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس اور کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات امتیازی پوزیشن میں پاس کیا۔ دورانِ تعلیم اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ رہے۔ جماعت اسلامی میں شرکت فرمائی اور مولانا مودودی مرحوم سے قریبی تعلق قائم رہا۔ ۱۹۶۵ء میں لاہور منتقل ہوئے اور مطالعہ قرآن حکیم کے متعدد حلقے قائم کیے۔ ۱۹۷۲ء میں تعلیمات وافکارِ قرآنی کے فروغ کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی۔ ۱۹۷۵ء میں غلبہ واقامتِ دین کے لیے تنظیم اسلامی کا قافلہ تشکیل دیا۔ ۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق کی شوریٰ میں کچھ عرصہ کے لیے شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے مختلف ٹی وی چینلز پر دروسِ قرآن' قومی اخبارات میں خصوصی کالم اور معروف کالجز اور یونیورسٹیز میں لیکچر کے ذریعے دین حق کا پیغام عام کیا۔ ڈاکٹر صاحب حق بات کو بے باک انداز میں کہنے کے قائل اور ۱۰۰ کے قریب کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے چار بیٹے' پانچ بیٹیاں اور دین کا درد رکھنے والے لاکھوں افراد سوگوار چھوڑے ہیں۔''

ان اخباری خبروں کی روشنی میں نماز جنازہ میں شریک ہونے والے نمایاں افراد یہ تھے: لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خواجہ محمد شریف' وزیراعلیٰ کے سینئر مشیر سردار ذوالفقار کھوسہ' صوبائی وزیر احمد علی اور چودھری عبدالغفور' جماعت اسلامی کے امیر سید منور حسن' سابق امیر قاضی حسین احمد' جامعہ اشرفیہ کے مہتمم مولانا فضل الرحیم' لیاقت بلوچ' فرید پراچہ' حافظ محمد ادریس' مولانا سمیع الحق' تحریک انصاف کے نائب صدر اعجاز چودھری' حافظ حسین احمد' حافظ زبیر احمد ظہیر' مفتی غلام سرور قادری' صدر دارالعلوم کراچی مولانا مفتی رفیع عثمانی' ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ مولانا حنیف جالندھری' مولانا عبدالرؤف فاروقی' جامعہ نصرت العلوم گوجرانوالہ کے مولانا زاہد الراشدی' روزنامہ پاکستان کے ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی' وغیرہم۔

وہ افراد جنہوں نے محترم بانی تنظیم کی وفات پر تعزیتی بیانات جاری کیے ان کے نام یہ ہیں: صدر پاکستان آصف علی زرداری، وزیراعظم یوسف رضا گیلانی، اسپیکر قومی اسمبلی فہمیدہ مرزا، چیئرمین سینٹ فاروق ایچ نائیک، مسلم لیگ نون کے قائد میاں نواز شریف، متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین، چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی، وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف، وزیراعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ، پروفیسر حافظ محمد سعید امیر جماعت الدعوۃ، مرکزی جماعت اہلحدیث کے امیر پروفیسر ساجد میر، نائب امیر علامہ زبیر ظہیر، حافظ عبدالقادر روپڑی، جے یو آئی کے مرکزی امیر مولانا فضل الرحمٰن، مولانا عبدالغفور حیدری، حافظ ابتسام الٰہی ظہیر، عمران خان، پروفیسر طاہر القادری، میر واعظ عمر فاروق، مفتی عثمان یار خان، مفتی محمد نعیم، جماعۃ الدعوۃ کراچی کے امیر انجینئر نوید قمر، محمد حسین محنتی، اسد اللہ بھٹو، شاہد ہاشمی، مفتی ابرار سلطان، شیخ کلیم اللہ، انس عباسی، مفتی محمد یوسف، کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، پاسبان کے صدر الطاف شکور، اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم سمیع اللہ حسینی، مجلس احرار کے امیر سید عطاء المہیمن بخاری، حزب التحریر کے ترجمان نوید بٹ، تحریک اہلحدیث کے علامہ عبداللہ غازی۔

اگلے تین روز تک قرآن اکیڈمی لاہور میں تعزیت کے لیے علماء کرام، مذہبی و سیاسی اکابر اور مختلف جماعتوں کے وفود تعزیت کے لیے آتے رہے، جن کا احاطہ اخباری رپورٹنگ میں نہیں ہوسکا۔ ان میں نمایاں افراد یہ تھے: وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف، صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ، سپیکر صوبائی اسمبلی رانا محمد اقبال، پروفیسر سید منور حسن، پروفیسر حافظ محمد سعید، حافظ عبدالرحمٰن مدنی، مولانا طارق جمیل، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا احمد اللہ صاحب، قاضی محمد یونس انور، حافظ محمد ادریس، لیاقت بلوچ، فرید پراچہ، حافظ سلمان بٹ، حامد کمال الدین۔ متحدہ قومی موومنٹ، ادارہ منہاج القرآن، پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے اساتذہ کے وفود بھی تعزیت کے لیے آئے۔ مزید برآں میاں محمد نواز شریف، وفاقی وزیر بابر اعوان، چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی، عمران خان اور بہت سے دیگر حضرات تعزیت کے لیے آئے۔ قرآن اکیڈمی لاہور میں تعزیت کے لیے آنے والے حضرات کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔

اس موقع پر بعض اخبارات نے خصوصی ایڈیشن بھی شائع کیے۔ روزنامہ خبریں، روزنامہ پاکستان اور روزنامہ جناح لاہور اس حوالے سے نمایاں رہے۔

روزنامہ جنگ کراچی کی اشاعت بابت ۱۷ اپریل ۲۰۱۰ء میں حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کی شان میں قاری محمد مسلم غازی کا تاریخی قطعہ وفات بھی شائع ہوا:

''خادمِ قرآن، ہمسرِ فلک''

۱۴۳۱ھ

چل بسا سب کو چھوڑ کر تنہا
قوم کا وہ مفکرِ اعلیٰ!
فکرِ قرآں کا وہ خطیبِ عظیم
تھا وہ دینی علوم میں یکتا!
اُس کے طرزِ کلام کے تھے اسیر
قوم کے سارے ادنیٰ و اعلیٰ
صاحبِ علم صاحبِ کردار
تھا مرقّع وہ علم و دانش کا
اُس سے خائف تھے منکرینِ حدیث
کوئی اس کا نہیں ہے ہم پلّہ
فہمِ قرآں کی روشنی تھا وہ
ہر طرف آج ہے اندھیرا سا
کل جو رونق تھا بزمِ ہستی کی
آج وہ باغِ خُلد میں پہنچا
قبر پر اُس کی رحمتیں برسیں
مغفرت کردے اُس کی اے مولا
اُس کی رحلت پہ آج اے غازی
غم زدہ ہیں تمام اہلِ وفا

اب ذرا توجہ اُن ادارتی صفحات پر فرمائیں کہ جن میں دانشورانِ وقت نے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ہم یہاں ذیل میں منتخب کالموں کے اقتباسات پیش کررہے ہیں۔

(۱) انتقال سے اگلے روز سب سے پہلا کالم جناب ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کا جنگ کے ادارتی صفحے پر شائع ہوا۔ اُن کے کالم کا عنوان تھا ''ایک چراغ اور بجھا''۔ وہ لکھتے ہیں:

''موت برحق ہے۔ اس سے کسی کو مفر اور استثناء حاصل نہیں' لیکن مبارک ہے وہ موت جو انسان کو مار کر بھی مار نہ سکے کیونکہ عاشقانِ الٰہی' عاشقانِ رسول ﷺ' دین کے خادم اور پیامبر' انسانیت کے غم کا بوجھ اٹھانے والے اور ملک وملت کی بے پایاں خدمت کرنے والے نظروں سے اوجھل ہو کر بھی زندہ رہتے ہیں' ان کا نام اور کام تاریخ کے صفحوں کو گرماتا اور لوگوں کے دلوں کو تڑپاتا رہتا ہے۔ دوستو! نعمت اور مبارک ہے ایسی زندگی اور مبارک ہے ایسی موت.....''

(۲) روزنامہ جنگ کراچی کے ادارتی صفحہ پر مورخہ ۱۶/اپریل کو جناب عرفان صدیقی کا کالم بعنوان ''ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم ومغفور'' شائع ہوا جس میں فصاحت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ وہ رقم طراز ہیں:

''پوری عمر قرآنی تعلیمات کی ترویج وتوسیع میں لگا دی۔ جسم وجاں کی تمام تر توانائیوں اور فکر ودانش کی ساری صلاحیتوں کو ایک مستقیم راہ پر مرکوز رکھتے ہوئے کمال بانکپن کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ میں نے ایسا عالمانہ جاہ وجلال کم لوگوں میں دیکھا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا حسن تھا۔ یہ انہی لوگوں کو عطا ہوتا ہے جن کا ایمان صورتِ فولاد پختہ ہوتا ہے اور جن کی فکر ہر طرح کے اینچ پینچ سے پاک ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی گفتگو ابہام سے قطعی مبرّیٰ ہوتی تھی اور وہ ایک ماہر استاد کی طرح اس طرح گتھیاں سلجھاتے چلے جاتے تھے کہ ان کی بات براہ راست دلوں میں گھر کر جاتی تھی۔ زمانہ طالب علمی کے چند برس چھوڑ دیے جائیں تو کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے کم وبیش ساٹھ برس انسانوں کی بستی میں اجالے بونے اور روشنیاں بانٹنے کا کام جاری رکھا۔ اللہ تعالیٰ فروغِ دین کے پیغمبرانہ مشن کے اس مشعل بردار کی قبر کو نور سے بھر دے اور اسے وہ مقام عطا کرے جو اس نے اپنے بندگانِ خاص کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ آمین!

ڈاکٹر صاحب کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ بہ یک وقت دینی اور دنیوی تعلیم سے آراستہ تھے۔ ہمارے ہاں کے علماء میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں انہوں نے مرکزی انجمن خدام القرآن کے قیام کی راہ ہموار کی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد تنظیم اسلامی کی بنیاد ڈالی جو اپنے اہداف ومقاصد کے حوالے سے اب ایک توانا تنظیم بن چکی ہے۔ میں سوچتا رہا کہ یہ کتنا بڑا خلا واقع ہو گیا ہے؟ کسی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے لیے پاکستان کو کتنے زمانے لگیں گے؟ کس کے قلم میں ایسی دلکشی اور کس کی زبان میں اتنی اثر پذیری ہوگی؟ عربوں کا قول ہے: ''عالِم کی موت ایک عالَم (جہان) کی موت ہوتی

ہے''۔ بلاشبہ ڈاکٹر اسرار احمد ایک شخص نہیں' علم وحکمت کا ایک جہان تھے۔ میں جب بھی ان سے ملا' مالا مال ہوگیا۔ لاہور میں ان سے دو ملاقاتیں دیر تک یاد رہیں گی۔ آخری ملاقات میں وہ خاصے کمزور لگے تھے۔ میری دلجوئی کے لیے دیر تک بیٹھے اور گفتگو کرتے رہے لیکن نقاہت عیاں تھی۔ مجھے اس وقت بھی محسوس ہوا تھا کہ آفتاب کنارے آلگا ہے۔ وہ مردِ حق اپنا کام کرگیا۔ ان کے صاحبزادے حافظ عاکف سعید کو اب اپنے عظیم والد کی میراث سنبھالنی ہے جو کارِ آساں نہیں۔ اللہ انہیں ہمت وتوفیق دے کہ وہ روشنیاں بونے اور اُجالے بانٹنے کا مشن اپنے والد کے سے جذب وجنوں کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔ آمین!''

(۳) روزنامہ اسلام کی ۱۶/اپریل کی اشاعت میں مولانا محمد ازہر صاحب کا مضمون شائع ہوا' مولانا موصوف نے لکھا:

''بعض فکری لغزشوں کے علاوہ دین پر عمل واستقامت کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی قابل تعریف ہے۔ وہ ایک صابر' شاکر اور قناعت پسند اور خوددار انسان تھے۔ ان کی خانگی زندگی آرائش وزیبائش' تعیشات' تصنع اور نمائش سے پاک تھی۔ گھر میں شرعی پردہ' مشرقی روایات کی پاس داری اور شریعت پر عمل کا اہتمام تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کے برملا اظہار میں کسی خوف اور بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ تنظیم اسلامی کے بانی اور امیر کی حیثیت سے وہ دوسرے لوگوں کی طرح حکومتی مراعات اور پیشکشوں سے فوائد حاصل کرسکتے تھے مگر انہوں نے کسی موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور آخر وقت تک درویشانہ اور فقیرانہ زندگی اور معاشرت پر قانع رہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب مرحوم بعض فکری لغزشوں اور بشری کمزوریوں کے باوجود ایک مردِ مؤمن' مجاہد فی سبیل اللہ' داعی الی الحق اور تاحیات اسلامی انقلاب ونظامِ خلافت کے منادی اور علمبردار رہے۔ ع ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!''

(۴) روزنامہ نوائے وقت نے ۱۵/اپریل کے اداراتی صفحہ پر یہ شذرہ لگایا:

''ڈاکٹر اسرار احمد نے وسیع مطالعہ کیا تھا' وہ بڑے زبردست اور شعلہ نوا مقرر تھے۔ آواز بڑی پاٹ دار تھی' مسلسل چار پانچ چھ گھنٹے خطاب کرتے اور ان کے ہزاروں سامعین زورِ خطابت کے سحر میں گرفتار بیٹھے رہتے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کو علمائے کرام میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ فصاحت وبلاغت انہیں عطا ہوئی تھی۔''

(۵) روزنامہ جنگ کراچی کے ایڈیٹر جناب محمود شام نے اپنے اداراتی نوٹ میں لکھا:

''ممتاز عالم دین اور خطیب ڈاکٹر اسرار احمد اگلے روز لاہور میں انتقال کر گئے اور بدھ کی شام ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا' انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ جس بات کو درست سمجھتے تھے اسے برملا کہنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے اور یہی سبب ہے کہ انہیں اس دشتِ پُرخار میں بسا اوقات تنہا صحرا نوردی کا احساس بھی ہوا لیکن وہ اپنے موقف پر چٹان کی طرح قائم رہے۔ بیماری بھی ان کے مشن کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہ بن سکی اور وہ واعظین و مبشرین کی جماعت کے سرخیل بنے رہے۔''

(۶) جنگ اخبار کے کالم نویس جناب عطاء الحق قاسمی نے اپنے کالم کے اختتام پر ان الفاظ میں تعزیت کی:

''ممتاز دینی اسکالر ڈاکٹر اسرار احمد گزشتہ منگل کے روز اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم و مغفور ایک جید عالم دین تھے۔ ان کی سوچ بظاہر کلاسیکی نوعیت کی تھی لیکن جدید علوم پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد' اقبال کے عاشق تھے اور ان کے سینکڑوں اشعار انہیں یاد تھے۔ مرحوم جاگیرداری کے سخت خلاف تھے اور اسے اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی سمجھتے تھے۔ وہ بہت اعلیٰ درجے کے مقرر بھی تھے۔ اجتہاد پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کی زندگی تقویٰ اور پرہیزگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔''

(۷) روزنامہ محشر کراچی کے ایڈیٹر نے سرخی لگائی: ''ڈاکٹر اسرار احمد۔ ایک اور لہر گزر گئی''

''ڈاکٹر اسرار احمد کے حوالے سے یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ جس بات پر تحقیق کر لیتے تھے اس پر جم جاتے تھے۔ بسا اوقات ان کے مخالفین ان کے اس انداز پر اعتراض بھی کرتے تھے کہ اس قدر شدت نہیں ہونی چاہیے' اجتہاد میں غلطی کی گنجائش تو رکھنا چاہیے' لیکن آج تو صورت یہ ہے کہ ایک ایک کر کے سوچنے والے علماء اٹھتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی پاکستانی قوم کو ایک ہی پیغام دے گئی ہے کہ پاکستانی قوم اسلام کے نام سے قائم ہونے والے اس ملک میں اقامتِ دین کی جدوجہد کرے اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک یہاں دین قائم نہ ہو جائے۔ یہی پاکستانی قوم کے لیے ڈاکٹر اسرار کا پیغام تھا' یہی ان کی زندگی کا مشن تھا' اس پر وہ ساری زندگی کاربند رہے' کبھی اسلامی جمعیت طلبہ میں' کبھی جماعت اسلامی میں اور کبھی تنظیم اسلامی میں' لیکن زندگی کا کوئی دور ایسا نہیں گزارا جس میں وہ اس فرض سے غافل رہے ہوں۔ ہر مسلمان پر یہ فریضہ اسی طرح واجب ہے جس طرح ڈاکٹر اسرار پر

تھا۔ ڈاکٹر اسرار سے وابستگی کا دم بھرنے والوں اور ان کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ اس مشن کو جاری رکھیں۔''

(۸) روزنامہ مقدمہ کراچی کے کالم نگار محمد جاوید اقبال نے لکھا:

''اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے کام رکتے نہیں ہیں۔ وہ قرآن کریم کے پیغام کی ترویج واشاعت کے لیے بندے مقرر کرتا رہتا ہے۔ اس لیے تنظیم اسلامی کے احباب سے درخواست ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے صدمے سے نڈھال اور دل برداشتہ ہوکر اپنی سرگرمیاں کم نہ کردیں۔ کیونکہ کتاب الہدیٰ کی ترویج واشاعت کا کام تاحیات جاری رہنا چاہیے۔''

(۹) روزنامہ جرأت کراچی کے کالم نویس جناب محمد زکی نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرمایا:

''عصرِ حاضر میں نہ صرف پاکستان بلکہ انڈیا میں بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنے اندازِ خطابت' علم کی وسعت' خلوصِ نیت اور محنت وریاضت سے تعلیم یافتہ طبقے کو دین کے حوالے سے بے حد متاثر کیا۔ وہ عام طرز کے ملا مولوی نہیں تھے بلکہ ان کی گفتگو دلیل اور علم پر مبنی ہوتی تھی۔ وہ دورِ حاضر میں پڑھے لکھے اور مغربی تعلیم سے آراستہ لوگوں کے لیے اسلام کے سفیر تھے۔''

(۱۰) معروف مفسرِ قرآن اور درس قرآن ڈاٹ کام کے حوالے سے معروف عالم دین مولانا محمد اسلم شیخوپوری صاحب نے ''ضربِ مؤمن'' میں اپنے ہفتہ وار کالم کا عنوان رکھا: ''ڈاکٹر صاحب'' اور بہت ہی بصیرت افروز تجزیہ فرماتے ہوئے تحریر فرمایا:

''حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ''اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اگر اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتے ہوئے یوں کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ ''ایک ڈاکٹر نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا''۔ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے' مغربی فلسفوں اور جدید نظریات پر نظر رکھتے تھے' مذاہب عالم کا بھی بقدر ضرورت انہوں نے مطالعہ کر رکھا تھا' انگریزی میں اظہار مافی الضمیر کی قدرت رکھتے تھے' نوجوانوں کی نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی' آواز میں طنطنہ اور اسلوب میں روانی اور دلکشی تھی' اس لیے جب وہ جدید تعلیم یافتہ مجمع میں اس زبان اور لہجے میں بات کرتے تھے جس کا وہ مجمع عادی تھا تو ان کی بات بہت توجہ سے سنی جاتی تھی۔ ابلاغ کے جتنے بھی ذرائع تھے انہوں نے بھرپور طریقے سے ان کا استعمال کیا۔ چنانچہ چند ہی سالوں میں ان کی آواز اکنافِ عالم میں

پھیل گئی۔ نوجوان نسل ان کا خصوصی ہدف تھی۔ اس نسل کو قرآن کے قریب لانے بلکہ قرآن کا داعی اور مبلغ بنانے کے لیے انہوں نے مختصر اور طویل دورانیے پر مشتمل مختلف کورسز شروع کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے مدرسینِ قرآن کی پوری جماعت وجود میں آ گئی۔ نماز تراویح میں جو تلاوت کی جاتی ہے اس کے ترجمہ اور خلاصہ کا سلسلہ بھی ان کی حسنات میں سے ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اور ایک حد تک کامیاب بھی رہا۔ اپنی زندگی کے پچاس ساٹھ سال کتاب اللہ کے علم وحکمت کی اشاعت میں لگا دینا ہی اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس پر ایک سچے مسلمان کو رشک آنا چاہیے۔ اس حقیقت کا اعتراف تو ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں کہ وہ شرعی مسائل واحکام کی اتباع اور ان پر استقامت میں مداہنت سے کام نہیں لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی شادیوں کے سلسلہ میں بھی سنت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا اور کسی قسم کی لچک دکھانے پر تیار نہ ہوئے۔ مظاہرِ شریعت کی پابندی اور علماء کے ادب و احترام میں بھی اپنے ذاتی تجربے کی حد تک میں نے ان کے متعلقین کو بہتر پایا ہے۔''

(۱۱) حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے ہفت روزہ رسالے ''گواہ'' نے ٹائٹل اسٹوری کے طور پر محترم ڈاکٹر صاحب پر خصوصی مضمون شائع کیا اور دو منظوم اظہاریے بھی۔ پہلی نظم کے شاعر ہیں ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی:

فکر و فن کا چراغ تھا نہ رہا
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
نام تھا جس کا ڈاکٹر اسرار
زندگی کا سراغ تھا نہ رہا
جس سے ہوتے تھے بہرہ ور سب لوگ
پُر ثمر ایسا باغ تھا نہ رہا
اُس کی تفسیر تھی نشاطِ روح
رنج وغم سے فراغ تھا نہ رہا
تیرہ و تار رہگذاروں میں
شمعِ دیں کا سراغ تھا نہ رہا
وہ تھا ایسا مفسرِ قرآں
جس کا روشن دماغ تھا نہ رہا

(۱۲) روزنامہ ایکسپریس کی ۱۸ اپریل کی اشاعت میں جناب مبشر لقمان کا خراج تحسین شائع ہوا ہے جسے بجا طور پر ''اعتراف'' کہا جا سکتا ہے۔ تحریر کا عنوان تھا: ''ڈاکٹر اسرار احمد: ۲۱ ویں صدی کا ستون''

''میں آپ کو ایک بات مکمل یقین کے ساتھ بتا سکتا ہوں کہ ان کے عقیدے اور ایقان سے قطع نظر وہ بے حد علم والے شخص تھے۔ کوئی ان کی منطق یا دلیل سے تو عدم اتفاق کر سکتا ہے لیکن بہت سے دنیاوی علوم پر ان کی دسترس اور قرآن حکیم کے بارے میں ان کی خوش کلامی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کئی مرتبہ ٹیلی ویژن پر ان کا انٹرویو کیا اور ہر بار میری دلیلوں کے باوجود انہوں نے اپنے تبحرِ علمی اور ارتکازِ توجہ سے مجھے ششدر کر دیا۔ ایک اینکر کی حیثیت سے مجھے اعتراف کرنے دیجئے کہ ہم بسا اوقات مہمان پر احمقانہ قسم کے الزامات عائد کر کے اسے ہتھے سے اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح مہمان اپنا ضبط کھو بیٹھتا ہے اور انٹرویو لینے والے کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ یہ کام بڑے حساب کتاب سے کیا جاتا ہے' لیکن ڈاکٹر اسرار کو کبھی اس طرح پھنسایا نہ جا سکا کیونکہ وہ صرف وہی بات کرتے تھے جس پر ان کا اعتقاد ہوتا تھا۔ وہ سفارتکاری میں کبھی بھی اچھے نہیں تھے بلکہ سیدھے سیدھے اپنے منطق کی بات شروع کر دیتے تھے جس کے لیے وہ مقدس کتاب اور سنت سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے ان سے مسجد الاقصیٰ کی تاریخ پر بات کی تو یقین کریں کہ وہ تاریخ کے کسی پروفیسر سے بھی زیادہ اس مضمون کے ماہر تھے۔ میں نے میڈیکل سائنس کی بات چھیڑ دی اس میں تو وہ پہلے ہی عروج پر تھے۔ میں نے بعض بہت سے تلخ حقائق بھی اکٹھے کر رکھے تھے جن کا جواب انہوں نے زور زبردستی سے نہیں دیا بلکہ دلیل سے اور دیانت داری سے دیا اور ان کے کردار کی یہ خوبی تھی کہ انہوں نے ان چند چیزوں کو تسلیم بھی کر لیا جو ہم میں سے کوئی بھی برسرِ عام نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ٹیلی ویژن پر کیا جائے۔ ان کے پائے کا ایک عالم تیار کرنے میں پچاس برس کا عرصہ لگا لیکن آج کے دن یہی بات بہت سے علمائے دین کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کی سائنس سے بھی کما حقہ آگاہ ہوں گے۔ انہوں نے دنیاوی پریکٹس عروج کے عالم میں چھوڑی اور تبلیغ شروع کر دی جس کے لیے حیرت انگیز نظم وضبط کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بہت زبردست یادداشت عطا کی تھی۔ ان کی آواز

بھی بہت کراری تھی اور شخصیت ایسی جسے کوئی بھی کبھی فراموش نہ کر سکے۔ ان کی زندگی اور جدّ وجُہد کے چار پانچ عشروں کو الفاظ میں سمیٹنا آسان نہیں اور نہ ہی ان لوگوں کو ان کے بارے میں قائل کرنا آسان ہے جنہوں نے کبھی بھی ان سے اتفاق نہیں کیا۔ ہم سب اپنے اعتقادات کے اسیر ہیں لیکن جو میں ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں صرف ایک جملے میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ کہ وہ ۲۱ویں صدی کے اسکالر تھے جو دانشوارانہ طور پر ۱۴صدیوں کا خلا پُر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے لیے' جو رسول پاک ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کو سمجھتے ہیں' اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی دوسری اس سے بہتر مثال نہیں ہے اور وہ زمینی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس قدر ممکن ہو سکے ان کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں کروڑوں لوگ ڈاکٹر اسرار احمد کی جدائی محسوس کریں گے۔ انہوں نے سب کو انسپائر کیا لیکن سب سے زیادہ ان کی جدائی ان علمائے کرام کو محسوس ہوگی جو دورِ جدید میں قرآن پاک کی تفہیم اور رہنمائی کے لیے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کے اہل خانہ کو یہ المناک نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ اور توفیق دے اور اللہ تبارک وتعالیٰ امت کو ان کے بہت سے متبادل عطا کرے جو ان کے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

(**۱۳**) روزنامہ جسارت کی ۲۴؍اپریل کی اشاعت میں جناب شاہ نواز فاروقی صاحب کا کالم بعنوان ''ڈاکٹر اسرار کی موت کا نقصان'' شائع ہوا' جس میں موصوف نے اپنے منفرد انداز میں تجزیہ کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

''دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی کئی حیثیتیں تھیں۔ وہ عالم تھے' تنظیم اسلامی کے بانی تھے' انجمن خدام القرآن کے مؤسس تھے' لیکن ڈاکٹر صاحب کی اصل حیثیت مدرس کی تھی۔ بلاشبہ وہ پاکستان ہی کے نہیں پورے برصغیر کے سب سے اچھے مدرس تھے۔ ان کے درسِ قرآن میں جو بات تھی وہ کسی اور کے درسِ قرآن میں نہیں تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی صورت میں برصغیر اپنے سب سے اچھے مدرس سے محروم ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شہرت کی ابتدا ٹی وی پر ان کے پروگرام الہدیٰ سے ہوئی۔ پی ٹی وی پر مذہبی پروگراموں کا معیار پست تھا اور یہ حکمرانوں کی پالیسی کے عین مطابق تھا۔ پی ٹی وی میں تقریباً طے تھا کہ سینٹر کا سب سے نااہل پروڈیوسر مذہبی پروگرام کرے گا۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کے پروگرام نے دیکھتے ہی دیکھتے زبردست مقبولیت حاصل کر لی۔ کسی اور شہر کے بارے میں تو ہمیں معلوم نہیں لیکن جس رات ڈاکٹر صاحب کا پروگرام نشر ہوتا تھا کراچی کی گلیوں میں آمدورفت کم ہو جاتی تھی۔ الہدیٰ کی ساخت یا format میں کوئی خاص بات نہیں تھی' جو بات تھی ڈاکٹر صاحب کے درسِ قرآن کے انداز میں تھی۔ پی ٹی وی پر نہ اس سے پہلے اتنا مقبول اور مؤثر مذہبی پروگرام ہوا تھا نہ اس کے بعد ہی کسی مذہبی پروگرام کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بلاشبہ یہ وصف مولانا مودودیؒ کی فکر اور تحریروں سے ماخوذ تھا۔ مگر فرق یہ تھا کہ مولانا کے لیے جو چیز ''تحریر'' تھی وہی ڈاکٹر صاحب کے یہاں ''تقریر'' تھی۔ تحریر کو تقریر بنانا آسان نہیں' یہ خوبی صرف عالم باعمل کے یہاں پیدا ہوتی ہے۔''

(۱۴) روزنامہ اسلام کے کالم نویس جناب اظہار احمد خان نے لکھا:

''ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لاحقہ میڈیکل کی تعلیم کے باعث تھا لیکن وہ عالم اسلام کے مسیحا بن کر اُبھرے۔ بلاشبہ ان کا مطالعہ بڑا ہی وسیع تھا۔ اردو' انگریزی' عربی' فارسی سب پر عبور حاصل تھا۔ برمحل اشعار اور تراکیب اور ماڈرن سامعین کے لیے انگریزی اصطلاحات' محاورے' ضرب الامثال' حوالہ جات اور چٹکلے اس حیران کن مہارت سے استعمال کرتے کہ حاضرین ہر وقت ہمہ تن گوش رہنے پر مجبور رہتے۔ زیر بحث معاملات پر سیر حاصل گفتگو فرماتے اور موضوع کا حق ادا کر دیتے۔ شانِ نزول کی تفصیلات اور جغرافیائی محل وقوع کی واقفیت' سننے والے کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر دیتے اور اس ماحول میں لا کھڑا کر دیتے جو واقعہ سے متعلق ہوتا تھا۔ مرحوم کے مشن اور جذبہ خدمت کا مظہر ان کی قائم کردہ تنظیم اسلامی ہے' ان کے جاری کردہ قرآن کورسز ہیں۔ انہوں نے اپنے پیغام کو کتابچوں اور کیسٹوں کے ذریعے دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیا ہے۔ دُنیا بھر میں جس جگہ بھی پاکستانی مسلمان آباد ہیں ان کا حلقۂ اثر موجود ہے۔ یہ وہ صدقہ جاریہ ہے جس کا کھاتا ان کے نام ہمیشہ کھلا رہے گا۔ حق یہ ہے کہ انہوں نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!''

(رپورٹ تیار کردہ: مرکز تعلیم و تحقیق' قرآن اکیڈمی یاسین آباد' کراچی)

❁❁❁

ہفت روزہ "ندائے خلافت" میں

بانیٔ تنظیم اسلامی بارے شائع ہونے والے مضامین

● بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی وفات کے متصلاً بعد ندائے خلافت کا خصوصی شمارہ شائع ہوا' جس میں ڈاکٹر صاحب کی حیات اور دینی خدمات کے بارے میں مختلف اہل علم ودانش کے مضامین شائع کیے گئے۔ یہ مضامین درج ذیل ہیں:

☆ اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا (اداریہ)	مرزا ایوب بیگ
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا سفر آخرت	مرتب: وسیم احمد
☆ بانیٔ تنظیم کی وفات پر امیر تنظیم کا رفقاء تنظیم کے نام پیغام	حافظ عاکف سعید
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی یاد میں (بانیٔ تنظیم اسلامی کی وفات پر "دنیا ٹی وی" کے خصوصی پروگرام میں اہلِ علم ودانش کا اظہارِ خیال)	مرتب: وسیم احمد
☆ قوم کا کیا بگڑتا.....	محمد سمیع
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی یادیں اور باتیں	خالد بہزاد ہاشمی
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایک شخصیت نہیں' فکر کا نام تھا	ڈاکٹر قمر احسان
☆ کیا داعیٔ قرآن کا انتقال ہو گیا؟	مرزا ندیم بیگ
☆ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم — ذکر چھڑ جائے تو.....	ارشاد احمد ارشد
☆ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم اور اُن کی خدمات	مجیب الرحمٰن شامی
☆ داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ اہلِ ہند کی نظر میں	مولانا شیخ رحیم الدین
☆ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟	انجینئر نوید احمد
☆ اِک دیا اور بجھ گیا	سیف اللہ خالد
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ: ۲۱ویں صدی کا ستون	مبشر لقمان
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ — ایک چراغ اور بجھا	ڈاکٹر صفدر محمود
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ذوقِ قرآن فہمی کو فروغ دیا	ابو عمار زاہد الراشدی
☆ اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	محمد یٰسین وٹو

☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایک عالم باعمل — معین کمالی
☆ قرب کا عالم کیا ہوگا! — فرقان دانش خان
☆ سائبان اٹھ گیا — محمد طارق چودھری
☆ ڈاکٹر اسرار احمد ﷺ — عبدالمجید ساجد
☆ ایک مردِ مجاہد، جواب ہم میں نہیں رہا — کیپٹن (ر) خالد سجاد

● اشاعت خصوصی کے بعد شمارہ نمبر ۱۸ شائع ہوا۔ اس میں درج ذیل مضامین شائع ہوئے:

☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا پیغام — مظفر اعجاز
☆ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور — عرفان صدیقی
☆ ایک ڈاکٹر نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا — مولانا محمد اسلم شیخوپوری
☆ قرآن کا ایک اور خادم ہم سے جدا ہو گیا — حافظ محمد طاہر محمود اشرفی
☆ تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند کا مصداق ہم سے بچھڑ گیا — نعیم اختر عدنان
☆ The Wayfarer — مریم سکینہ
☆ His Legacies will be paramount — شمیم صدیقی

● شمارہ نمبر ۱۹ میں شائع ہونے والے مضامین:

☆ ڈاکٹر اسرار احمد کی دینی خدمات — حافظ عاکف سعید
☆ اک اور شاہ بلوط ٹوٹ گرا — محمد عطاء اللہ صدیقی
☆ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا — ڈاکٹر اے آر خالد
☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ قدیم و جدید کا حسین امتزاج — ضمیر اختر خان
☆ A Last Meeting with Dr. Israr Ahmad — ڈاکٹر مظفر اقبال

● شمارہ نمبر ۲۰ میں بانیٔ تنظیم بارے درج ذیل مضامین شائع ہوئے:

☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ پاسبانِ عظمتِ قرآن — عزیز احمد اعوان
☆ اسرار انقلاب کو دیکھیے — محمد سمیع
☆ امیر تنظیم اسلامی کے نام تعزیتی مکتوب — محمد فہیم خان
☆ پریس کلب لاہور میں بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی یاد میں تعزیتی ریفرنس — رپورٹ: عزیز احمد خان

❁❁❁

اعلان برائے داخلہ خصوصی سہ ماہی کورس

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

دینی وعصری علوم کی منفرد دانش گاہ

کُلیة القرآن (قرآن کالج) لاہور

میں ان طلبہ کے لیے

جو مڈل کے امتحان سے فارغ ہو چکے ہیں' ایک خصوصی سہ ماہی کورس کا اہتمام کیا گیا ہے' تاکہ یہ طلبہ کلیۃ القرآن میں درجہ اولیٰ اور 9th کلاس میں داخلے کے مطلوبہ معیار پر پورے اتر سکیں۔

نصاب

درجہ اولیٰ اور 9th کلاس کی تیاری کے لیے مندرجہ ذیل مضامین کی تدریس ہوگی:

۱) تجوید ۲) عربی زبان ۳) ریاضی
۴) اردو ۵) انگلش ۶) نحو
۷) صرف ۸) خصوصی تربیتی لیکچرز

کلاسز کا آغاز ۱۸/جمادی الاولیٰ بمطابق 3 مئی 2010ء سے ہو چکا ہے۔

(نشستیں محدود ہیں' اس لیے والدین سے گزارش ہے کہ وہ جلد از جلد رابطہ کریں)

ہاسٹل میں رہائش کی سہولت [illegible]

برائے رابطہ: **کلیة القرآن (قرآن کالج)**

191۔اے' اتاترک بلاک' نیوگارڈن ٹاؤن لاہور فون: (042)35833637

ذیلی دفتر: **قرآن اکیڈمی**

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور فون: (042)35869501-3

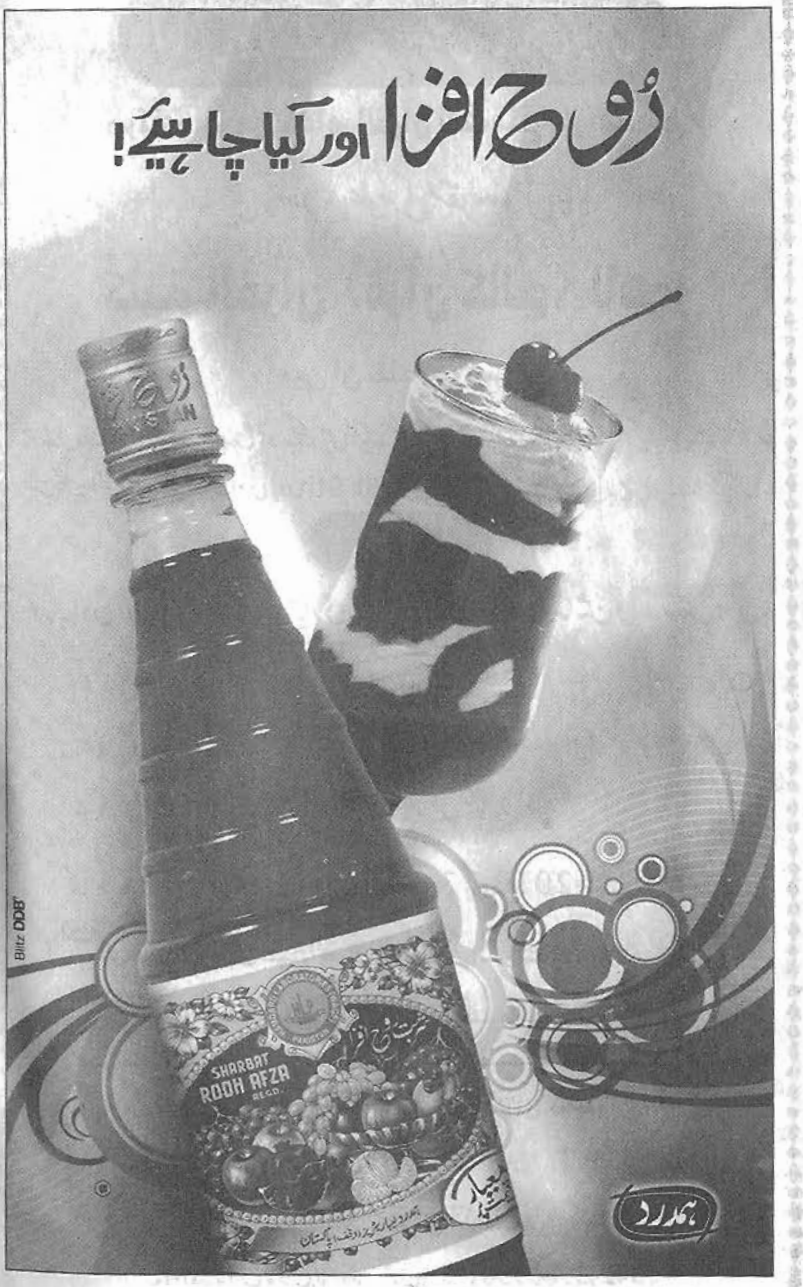
رُوح افزا اور کیا چاہیئے!
SHARBAT
ROOH AFZA
REG'D.
ہمدرد

بانیٔ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تصانیف

داعی رجوع الی القرآن کا شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن
اب کتابی شکل میں بعنوان
بیان القرآن
حصہ اوّل: سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات: 520 قیمت: 400 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر کے
شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے
حقیقت و اقسامِ شرک
قیمت اشاعت عام: 50 روپے، خاص: 90 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں
اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم
منہجِ انقلابِ نبویؐ
مجلد 300 روپے، غیر مجلد 200 روپے

بعثتِ انبیاء کا اساسی مقصد
بعثتِ محمدیؐ کی اتمامی و تکمیلی شان
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت
اشاعت خاص 40 روپے، عام 30 روپے

ایک مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی
ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
دینی فرائض کا جامع تصور
اشاعت خاص 25 روپے، عام 15 روپے

ایمان کے علمی اور شرعی معنی، ایمان کا فلسفہ اور ایمان و عمل کا باہمی تعلق
اپنے موضوع پر لاثانی تحقیقی و فکری تصنیف
حقیقتِ ایمان
اشاعت خاص 120 روپے

سورۃ العصر کی روشنی میں
راہِ نجات
اشاعت خاص 45 روپے، عام 30 روپے

قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ؟
عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی
اشاعت خاص 25 روپے، عام 15 روپے

اُمتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل
اور نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت
مجلد 100 روپے، غیر مجلد 45 روپے

پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کے حال اور مستقبل کے
تناظر میں لکھے گئے فکر انگیز اخباری کالموں کا مجموعہ
بصائر
صفحات: 130 قیمت: 65 روپے

تحریکِ پاکستان کا تاریخی و سیاسی پس منظر،
اسلامیانِ پاکستان کا تہذیبی و ثقافتی پس منظر
اسلام اور پاکستان
اشاعت خاص 60 روپے، عام 35 روپے

برعظیم پاک و ہند میں
اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل
اور اس سے انحراف کی راہیں
ڈیلکس ایڈیشن 50 روپے

دعوت رجوع الی القرآن کی اساس اور تعمیل ... دستاویز
جس کا انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی میں ترجمہ ہو چکا ہے
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
اشاعت خاص 40 روپے، عام 20 روپے

سابقہ اور موجودہ
مسلمان اُمتوں کا ماضی، حال اور مستقبل
اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری
اشاعت خاص 100 روپے

ڈاکٹر صاحب کے دو خطبات کا مجموعہ
اسلام میں عورت کا مقام
اشاعت خاص 80 روپے، عام 50 روپے

مکتبہ خدام القرآن 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-042-35869501، فیکس: 042-35834000
email: maktaba@tanzeem.org

مفصل فہرست طلب کیجیے

May 2010
Regd CPL No. 115
Vol.59
No.5

Monthly **Meesaq** Lahore

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

حصہ اول کے بعد اب حصہ دوم بھی شائع ہو گیا ہے

سورۃ آل عمران، سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ کا ترجمہ مع مختصر تشریح

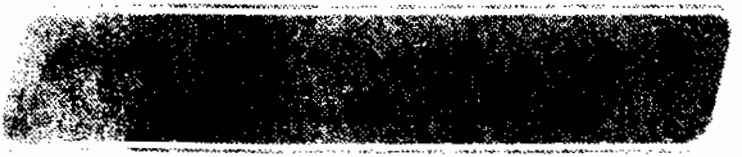

ملنے کے پتے

انجمن خدام القرآن خیبر پختونخواہ، پشاور

A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)